فاصلے،قربتیں

(انشائیے)

حیدرقریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد

FASLEY , QURBATEN

(Inshaiyay...Ligt Esseys)

By: Haider Qureshi

Year of 1st Edition: 2014

Price: Rs. 50/-

نام کتاب:	فاصلے،قربتیں(انشائیے)
مصنف:	حیدرقریشی
مصنف کا پتہ:	Rossertstr.6, Okriftel, 65795 Hattersheim,Germany
	E-Mail: haider_qureshi2000@yahoo.com
سرورق:	ارشدخالد
سنِ اشاعت اول:	فروری2014 ء
قیمت:	50 روپے
مطبع:	جاوید بٹ پرنٹنگ پریس۔لاہور

Published By

AKKAS INTERNATIONAL

House No 1164 Street No 2 Block C

National Police Foundation ,Sector O-9

Lohi Bhair, Islamabad, Pakistan

Tel.0300-5114739 0333-5515412

....

E- Mail:

akkasurdu2@gmail.com

انتساب

ابا جی کے بڑے بھائی

اپنے بابا جی کے نام

جنھوں نے ایک انشائیہ نگار جیسی زندگی بسر کی

نظر سے دور ہے لیکن نظر میں ہے پھر بھی
کہ عکس اپنے مرے آئنوں میں چھوڑ گیا

ترتیب

حیدرقریشی کی کتب

شاعری(غزلیں،نظمیں،ماہیے):

۱۔سلگتے خواب۔۲۔عمرِ گریزاں۔۳۔محبت کے پھول۔۴۔دعائے دل۔۵۔درد سمندر۔۶۔زندگی

(یہ چھ شعری مجموعے **قفس کے اندر** ۲۰۱۴ء کے ایڈیشن میں یک جا کر دیئے گئے ہیں)

نثر(افسانے،خاکے،یادیں،انشائیے،سفرنامہ):

۱۔روشنی کی بشارت۔۲۔قصے کہانیاں۔۳۔میری محبتیں۔۴۔کھٹی میٹھی یادیں۔۵۔فاصلے قربتیں۔

۶۔سوئے حجاز۔ (یہ چھ کتابیں **خواب کے اندر خواب** میں یک جا کر دی گئی ہیں۔)

(پہلے پانچ شعری مجموعے اور چھ نثری کتابیں **عمرِ لاحاصل کا حاصل** میں بھی شامل ہیں)

تنقیدومباحث:

۱۔حاصلِ مطالعہ۔۲۔تاثرات۔۳۔مضامین اور تبصرے۔۴۔گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت

۵۔ستیہ پال آنند کی بودنی نابودنی۔۶۔وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت۔

(یہ چھ کتابیں **ہمارا ادبی منظر نامہ** میں یک جا کر دی گئی ہیں)

اردو ماہیا تحقیق وتنقید:

۱۔اردو میں ماہیا نگاری۔۲۔اردو ماہیے کی تحریک۔۳۔اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما۔

۴۔اردو ماہیا۔۵۔ماہیے کے مباحث

(یہ پانچوں کتابیں **اردو ماہیا تحقیق وتنقید** میں یک جا کر دی گئی ہیں)

حالاتِ حاضرہ(کالم):

۱۔منظر اور پس منظر۔۲۔خبرنامہ۔۳۔اِدھر اُدھر سے۔۴۔چھوٹی سی دنیا۔

(یہ چاروں کتابیں **حالاتِ حاضرہ** میں یک جا کر دی گئی ہیں)

یہ ساری کتابیں الگ الگ بھی اور مذکورہ بالا کلیاتی صورتوں میں بھی اس لنک پر دستیاب ہیں۔

http://haider-qureshi.blogspot.de/

حیدرقریشی کی انشائیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

عامرسہیل (ایبٹ آباد)

حیدرقریشی کا تخلیقی سفراور فکری جہات کا ذکراُن کی انشائیہ نگاری کے بغیر نامکمل ہے۔
اس صنف میں اُن کی دلچسپی کا پس منظر خاصا وسیع ہے لیکن یہ طے ہے کہ اُنھوں نے اپنی نثر کی فسوں سازقوت کی بدولت بہت جلد انشائیہ نگاری میں اپنی انفرادیت منوالی تھی۔اُن کے انشائیے کتابی صورت میں طبع ہونے سے پہلے پاک و ہند کے مقتدر معاصرادبی جرائد میں اشاعت پذیر ہوتے رہے ہیں۔بعدازاں یہ تمام انشائیے''فاصلے،قربتیں''کے نام سے انٹرنیٹ پرآ گئے اور پھر کچھ عرصے بعدان تمام انشائیوں کوشعری ونثری کلیات'' عمرِ لاحاصل کا حاصل''میں یکجا کر کے شائع کر دیا گیا۔یہ کلیات کتابی صورت میں دستیاب ہونے کے علاوہ انٹرنیٹ پربھی پڑھا جا سکتا ہے۔۔گفتگو کومزید آگے بڑھانے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انشائیے کی تعریف،اصطلاح اورحدود پراجمالاًبات کرلی جائے تاکہ تفہیم میں آسانی رہے۔

انشائیہ کیا ہے؟

ڈاکٹرسلیم اختر نے لکھا ہے:

''جدید تنقید میں غالباً انشائیہ وہ واحد صنفِ ادب ہے جس کے بارے میں نزاعی نظریات اور جذباتی مقالات لکھے جاتے ہیں۔اس کی تعریف اورآغاز دونوں پر لے دے ہورہی ہے۔''[۱]

یہ رائے حقائق پرمبنی ہے۔آج سے تقریباًنصف صدی قبل جب ڈاکٹر وزیرآغا اوراُن

کے قریبی رفقا نے اپنی تحریروں کوانشائیہ کہنا شروع کیا تو بحث ومناظرے کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اورخوابِ جوانی کی مانند''انشائیہ''کی بھی نت نئی تعبیریں کی گئیں۔اس تمام نزاع کی اصل وجہ یہ تھی کی بے شمار ناقدین انشائیہ کی اصطلاح کومضمون کے ساتھ خلط ملط کر رہے تھے اوردبستانِ سرگودھا کے سنجیدہ تخلیق کاراورناقدین ومحققین اس صنف کومضمون اورمقالہ نگاری سے الگ صنف ثابت کر نے میں مصروف تھے۔اگران تمام نزاعی امور پرنظرکی جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انشائیہ جیسی نئی صنف پر بات کرتے ہوئے عدل وانصاف اورمعروضی حقائق وشواہد کوپسِ پشت ڈال کر محض جذباتی تنقیدیں لکھی جاتی رہی ہیں،اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ انشائیہ کواردوادب میں قدم جمانے میں خاصی تاخیر ہوگئی۔

جدید عہد میں انشائیہ پرنظرڈالی جائے تو علم ہوتا ہے کہ تمام تر رکاوٹوں اورسازشوں کے باوجوداس صنف نے اپنی انفرادیت کالوہا منوایا ہے اورڈاکٹر وزیرآغا کی زیرِ تربیت انشائیہ نگاری پرتخلیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں کاایک وسیع حلقہ تیار ہو چکا ہے۔

انشائیہ کی تعریف

ڈاکٹر وزیرآغا کے بقول:

''انشائیہ اُس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگاراسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یامظاہر کے مخفی مفاہیم کوکچھ اس طورگرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعوراپنے مدار سے ایک قدم باہرآ کر ایک نئے مدارکووجود میں لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔''[۲]

یہ تعریف منطقی اعتبار سے جامع اور مانع ہے اورانشائیہ کے تمام اوصاف کومحیط ہے۔
انشائیہ کا اسلوب شگفتہ اورغیررسمی ہوتا ہے،اورطنز ومزاح کے عناصر اگرشامل ہوں تو کوئی حرج نہیں لیکن اس صنف کے لئے طنز ومزاح کی شرط لازمی نہیں ہے۔ڈاکٹر وزیرآغا اس حوالے سے روشنی فراہم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''دراصل اُسلوب کی شگفتگی یااس میں طنز ومزاح کی آمیزش کوانشائیہ کے لئے ناگزیر

قرار دینا کسی صورت بھی مستحسن نہیں ہے۔ انشائیہ میں طنز کی کاٹ یا مزاح کی پھلجھڑی کا در آنا انشائیہ نگار کے خاص موڈ یا مزاج کا رہینِ منت ہوتا ہے۔'' ۳ے

انشائیے کے موضوع عموماً ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ اور انشائیہ نگار اپنے زورِ تخیل اور شخصی زاویہء نظر اختیار کرتے ہوئے اپنے موضوع کے ایسے ایسے پوشیدہ گوشے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے جو اَب تک نظروں سے اوجھل تھے۔ انشائیہ نگار کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے چنیدہ موضوع کو معمولی یا غیر معمولی بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ عام مضمون کے برعکس انشائیہ میں منطقی ترتیب کا فقدان ہوتا ہے اور اصلاح پسندی یا کسی خاص نقطۂ نظر کا پرچار کرنا اس صنف میں مناسب نہیں سمجھا جاتا۔

انشائیہ نگاری کے ضمن میں جو اختلافی مباحث منظر عام پر آئے اگر ان کا غیر جانب داری سے محاکمہ کیا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اکثر ناقدین انشائیہ کو مضمون ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل قرار دیتے ہیں اور مضمون نگاری کے جملہ اوصاف کو انشائیہ میں متحرک دیکھنے کے خواہش مند ہیں، بدیں سبب سر سید احمد خان کی اُن تحریروں کو بھی انشائیہ کہا جانے لگا جس میں پند و نصائح اور مقصدیت کے عناصر حاوی تھے۔ اکبر حمیدی اس صنف کے دیگر وصفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

'' انشائیہ نگار نئے عہد کی نئی زندگی کے نئے نئے رخ نئے انسان کی اظہاری تقاضوں کا دور تک ساتھ دیتا ہے۔'' ۴ے

انشائیہ کے مزید اوصاف ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول کچھ یوں ہیں:

'' انشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنف نثر ہے جو قاری کو بیک وقت لطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے۔ اسی لیے میں اسے امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ، شعر کی لطافت اور سفر نامے کا فکری تحرک یکجا ہو گئے ہیں۔'' ۵ے

مسرت کا حصول انشائیہ نگاری کا وہ اہم مقصد ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے انشائیہ نگار

کے پیش نظر رہتا ہے۔ اور خیالات کی تعمیر و تشکیل میں اپنا جلوہ دکھا جاتا ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو مونتین (Montaine) کی پیروی کا عمل آج بھی جاری ہے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں کا تجزیاتی مطالعہ

حیدر قریشی کے کلیاتِ نظم و نثر ''عمرِلا حاصل کا حاصل'' میں کل دس انشائیے شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں:

انشائیوں کے عنوانات:

۱۔ خاموشی ۲۔ نقاب ۳۔ وگ ۴۔ فاصلے قربتیں
۵۔ بڑھاپے کی حمایت میں ۶۔ اطاعت گزاری ۷۔ خیر و شر کے سلسلے
۸۔ چشمِ تصور ۹۔ اپنا اپنا سچ ۱۰۔ تجربہ اور تجربہ کاری

انشائیہ نگاری میں عنوان کی اہمیت دوسری اصناف کی نسبت قدرے زیادہ ہے۔ انشائیہ نگاری اور تحلیلِ نفسی میں یہ نقطہ قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے کہ دونوں میں کسی ایک عنوان کے گرد سوچوں کا پورا ہالہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ اور خیالات میں ربط یا بے ربطی کا اپنا اپنا جواز بنتا ہے اور ہر ایک کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اردو، انگریزی اور فرانسیسی انشائیہ نگاروں نے عنوانات کا چناؤ زندگی کے از حد عمومی پہلوؤں سے کیا ہے۔ مثلاً بٹن، کمرہ، کھڑکی، سڑک، ایک درخت، صدائے بازگشت، اداس آئینے، کرسی، روشنی اور دیوار وغیرہ۔ عنوان کی عمومیت بذاتِ خود ایک خوبی شمار ہوتی ہے کیوں کہ ایک اچھا تخلیق کار اپنے انشائیے میں عام اشیاء سے خاص اشیاء کی جانب اُڑان بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس تمہیدی پس منظر کے بعد حیدر قریشی کے چند نمائندہ انشائیوں کا فرداً فرداً تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ خاموشی

حیدر قریشی نے اپنے اس انشائیے کا آغاز اِن الفاظ سے کیا ہے:

'' ہنگامہ اور شور زندگی کے صحیح عکاس نہیں۔ اسی طرح سناٹا اور ویرانی بھی

زندگی کے ترجمان نہیں ہیں۔ان کے برعکس خاموشی زندگی کی حقیقی عکاسی کرتی ہے۔ جولوگ سناٹے اورخاموشی میں فرق نہیں کر پاتے وہ خاموشی کی اہمیت نہیں جان سکتے۔سناٹا بے روح اور بےآواز ہوتا ہے جب کہ خاموشی زندگی کی عکاس ہی نہیں،زندگی کوجنم بھی دیتی ہے۔'' ۶

خامشی بظاہر ہماری زندگی کا ناگزیر حصہ ہےاورروزمرہ کےمعمولات میں خاموشی بھی کسی نہ کسی حوالے سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے،لیکن جب زندگی کا یہی عمومی مظہر انشائیہ نگار کا موضوع بنتا ہےتو اس کے نت نئے انوکھے زاویے ہمارے سامنے آنا شروع ہوجاتے ہیں۔محولہ بالا اقتباس میں خردافروزی تو اپنی جھلک دکھارہی ہے،اس کے جلو میں خیال افروزی کی کرنیں بھی جگمگ جگمگ کررہی ہیں۔یہ ایک تیکھی بات ہے جو پڑھنے والوں کے احساسِ لطافت کو مہمیز لگاتی ہے۔نثری بیانیہ تخیل کووسعت آشنا کررہا ہے۔

سناٹے اورخاموشی کا فرق وہی واضح کرے گا جوتخیل کی میناکاری سے نئی دنیا آبادکرنے کا سلیقہ جانتا ہو۔حیدرقریشی نے کمال مہارت سے ایک فلسفیانہ نکتے کوعام فہم انداز میں چلتے پھرتے بیان کردیا ہے۔یہی وہ تخلیقی ذہانت ہے جوانشائیے کا اصل جوہر ہے۔ڈاکٹرسلیم آغا قزلباش اسی نکتے کوذرا گہرائی میں جاکرزیربحث لاتے ہیں،اُن کا کہنا ہے:

'' انشائیہ ایک گھتی ہوئی تحریر ہےجس میں ایک نقطہ خیال سے پھوٹتا ہے اورپھیل کردوبارہ پہلے نقطے میں سمٹ آتا ہےمگراس فرق کے ساتھ کہ جب یہ دوبارہ مرکزی نقطے کو چھوتا ہےتو معنی کی ایک نئی پرت،فکر کا ایک انوکھا زاویہ اورخیال کی ایک تازہ لہرنمودار ہوجاتی ہے۔'' ۷

اس بیان میں اگرنفسیاتی کیفیت کا اضافہ کرلیں تو کئی دوسرے پہلونمایاں ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔

حیدرقریشی اب خاموشی کے مرکزی نقطےکومضبوطی سے تھامے اپنے موضوع کی دوسری پرتوں کوکھولنا شروع کرتے ہیں:

''کسی ہنگامہ خیز،پرشور ماحول نے نہ کبھی دوسچے دلوں کو ملنے دیا ہےاورنہ

کبھی کوئی سچا صوفی پیدا کیا ہے۔'' ۸

یہی وہ اختصار ہے جوانشائیے کومعتبر بناتا ہے۔مصنف نے دنیا کی اتنی بڑی حقیقت کو غیررسمی طریقِ کاراور شخصی نقطۂ نظر کی بدولت محض چندالفاظ میں سمیٹ دیا ہے۔غزل کی طرح انشائیے میں بھی کوئی بات خلافِ واقعہ نہیں ہوتی یا اگرکوئی خیال خلافِ واقعہ آجائے تو اس کی کوئی اپنی منطق یااپنا کوئی پس منظرلازماً ہوگا۔تاہم غزل کی ایمائیت اپنی پوری توانائی کے ساتھ انشائیہ میں بھی مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔

حیدرقریشی نے اپنے انشائیے میں اُس تاریخی سچ کوبھی فنکارانہ حُسن کے ساتھ پیش کیا ہےجس کے بغیرخاموشی کی معنویت کا تذکرہ ادھورارہ جاتا:

''سقراط نے زہر پی کر،حسینؑ نے شہید ہوکراورابنِ منصور نے سولی قبول کرکے خاموشی سے صبر کے جوعظیم نمونے دکھائے،بظاہر وہ اُس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست تھی،لیکن درحقیقت اُن مظلوموں اورسچوں کی خاموشی اُن کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔'' ۹

اگرچہ یہ کوئی تاریخی انشائیہ نہیں ہےاس کے باوجود تاریخیت کے حُسن سے مملو ہے۔

اکبرحمیدی انشائیے کے نئے افق تلاش کرتے ہوئے یہاں تک رعایت دیتے ہیں:

''جس ماحول کا انشائیہ لکھا جائے اُس کے ماحول کوتبدیل نہ کیا جائے۔ مثال کےطور پرتاریخی انشائیہ لکھا جائےتو تاریخی مدار سے باہر نہ جایا جائے بلکہ اس کے گوشوں کی سیاحت کروائی جائےاورتاریخی ذائقے کواوّل تا آخر بحال رکھا جائے۔'' ۱۰

حیدرقریشی کے اس انشائیہ میں تاریخی حوالے بھی آئے سوانھوں نے اکبرحمیدی کی بات پرعمل کیااوربے ساختہ کچھ ایسے واقعات کا ذکرکیا جن کا تعلق ماضی قریب سے بنتا ہے۔

ڈاکٹرسلیم اختر نے اپنے ایک مضمون میں انشائیے کی تکنیک کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انشائیے کا ایک وصف یہ بتایا تھا:

''عنوانات کا موضوع یانقطۂ نظر سے ہم آہنگ نہ ہونا۔'' ۱۱

لیکن حیدر قریشی کے انشائیوں میں ایسی کیفیت نہیں ملتی، اُن کے اکثر انشائیے مشمول ''خاموشی'' اپنے عنوان سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ رائے انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ اگر سو انشائیوں میں سے ایک آدھ انشائیہ ایسا نکل آئے جس کا عنوان اپنے موضوع سے ہم آہنگ نہ ہو تو اس سے یہ نتیجہ ہرگز برآمد نہیں ہوتا کہ باقی ۹۹ انشائیے بھی اپنے موضوع سے انحراف پر مبنی ہوں گے۔

حیدر قریشی کے انشائیوں میں نفسیاتی بصیرت کا اظہار ایک لازمی امر ہے، ''خاموشی'' میں یہ رنگ گہرا ہوتا نظر آتا ہے لیکن انشائیے کی تکنیک اور اسلوب کو بوجھل نہیں بناتا، یہ مثال ملاحظہ ہو:

''خاموشی خیر کی علامت ہے جب کہ شور، شر کا مظہر ہے۔ شور پسند لوگ شورش پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ فتنہ فساد کی سوجھتی ہے جب کہ خاموشی پسند کرنے والے فطرتاً امن پسند ہوتے ہیں۔ اُس شوہر کی ازدواجی زندگی کبھی ناکام نہیں ہوسکتی جو مزاجاً امن پسند ہو، چاہے اُس کی بیوی کتنی ہی جھگڑالو کیوں نہ ہو۔ کیونکہ خیر کی قوت بالآخر شر کی قوت پر غالب ہی آتی ہے۔ اسی لئے تو غالب نے کہا تھا: ؎ ایک خاموشی پر موقوف ہے گھر کی رونق۔'' ۱۲

یہی نکتہ آفرینی انشائیے کو انشائیہ بناتی ہے۔ ''خاموشی'' زندگی سے پوری طرح منسلک تحریر ہے جو حسن و خیر کے متنوع پہلوؤں کو اُسی مرکزی دھارے میں رکھ کر زیرِ بحث لاتی ہے جس عنوان کے تحت یہ انشائیہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ عنوان بذاتِ خود اکائی کی وہ تجسیم ہے جو موضوع میں بکھری نظر آتی ہے۔ قاری ''خاموشی'' کو پڑھتے ہوئے یہ تاثر بھی اخذ کرتا چلا جاتا ہے کہ اس انشائیے کی مجموعی فضا رجائیت پر مبنی ہے۔ اس انشائیے کو پڑھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قاری دورانِ مطالعہ ایک عام انسانی سطح سے اوپر اُٹھ کر انشائیے میں چھپے اُس عارفانہ تجربے کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جو زندگی کو حسین اور آسان بناتا ہے۔ انشائیے کا یہ نادر پہلو ہمیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے انشائیہ نگار بذاتِ خود اپنی تحریر میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ اگر انشائیہ نگار اس صنف کے اہم فطری عناصر کو ساتھ لے کر چلے گا تو اُس کی تحریر میں نامیاتی تاثر آفرینی پیدا ہو جائے گی۔

انشائیہ ایک ایسی ظالم صنف ہے کہ اس میں انشائیہ نگار کی اپنی ذات کسی نہ کسی حوالے سے اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ انشائیہ نگار کی کشادہ ذہنی، بالغ نظری، وسعتِ قلبی، انسان دوستی اور وسیع المشربی یا اس کے برعکس بخیلی، دشمنی، حسد، کینہ اور بزدلی کا عکس انشائیے میں اپنی موجودگی لازماً ظاہر کرے گا۔ جن نقادوں نے انشائیہ نگاری اور تحلیلِ نفسی کے مابین مماثلت کا ذکر کیا اُس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ دونوں صورتوں میں انسان کا باطن بہر صورت بے نقاب ہو جاتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب، اگر یہ کہا جائے کہ حیدر قریشی کا یہ انشائیہ فرد کی وجدانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور انفرادی سوچ کو تقویت فراہم کرتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ حیدر قریشی کو زندگی سے پیار ہے۔ وہ زندگی کی سرگرم کیفیات کے رمز شناس، انسانی اقدار کے حامی اور ہمدردی کے اوصاف سے مالا مال ہیں اور یہ تمام رویے اُن کے انشائیے ''خاموشی'' میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جمیل آذر کی یہ رائے دیکھئے جس میں وہ انہی اوصاف کو ذرا عمومی پیرائے میں بیان کر رہے ہیں لیکن ان کا اطلاق حیدر قریشی پر بھی ہوتا ہے:

''انشائیہ نگار وحدتِ انسانی کا علمبردار ہے وہ رنگ، نسل، زبان اور قومیت سے ماورا ہو کر عظمتِ انسانی کا علمبردار ہے۔ اُس کے ہاں انسان سے آفاقی محبت کا تصور بدرجہ اتم ملتا ہے۔'' ۱۳

اس انشائیے میں فکری اور اشاراتی عناصر موضوع کی تہہ داری اور تنوع میں خوبصورت اضافے کر رہے ہیں۔

(۲) بڑھاپے کی حمایت میں:

بڑھاپا بظاہر ایک ایسا نفسیاتی موضوع ہے جس سے ہر شخص بھاگتا ہے اور اور عمر کی اس فطری تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتا۔ حیدر قریشی اپنے انشائیے ''بڑھاپے کی حمایت میں'' اس عمومی رویے کے برعکس بڑھاپے کا خیر مقدم نہایت فراخ دلی سے کر رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے بڑھاپے کو اپنا ہمزاد اور ہم راز بنا کر پیش کیا ہے اور آنے والے دور کے بے پناہ امکانات کو کھلی بانہوں کے ساتھ خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک بڑھاپے کو ٹالنا یا نا

اُمیدی کوخود پر مسلط کرنا درست نہیں۔وہ زندگی کے تینوں ادوار کومعروضی سطح پر جانچنے کے بعد کہتے ہیں:

''جس طرح ہم اپنے حال میں رہ کر اپنے حال سے بے خبر ہوتے ہیں، ایسے ہی جوانی میں بھی اپنے آپ سے بے خبری کا عجیب عالم ہوتا ہے۔لیکن بڑھاپا مستقبل کی طرح یقین اور بے یقینی کی دھند میں لپٹا ہوا عالمِ برزخ ہے۔ یہاں سے آگے انسان کے ماورائے زمان ومکاں ہونے کا سفر شروع ہوتا ہے۔'' ۱۴

حیدر قریشی نے محولہ بالا اقتباس میں بہت دھیمے انداز میں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ''بڑھاپے'' کا مایوسی اور اذیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا بلکہ یہ گذشتہ عمر کی بے چہرگی کو حسن عطا کرتا ہے اور زمان ومکاں سے آزاد کراتا ہے۔آزادی کا یہ سفر اصل میں نئے جہانوں کی سیر ہے اور انسان میں ایک بار پھر جینے کی امنگ پیدا کرتا ہے۔درد وکرب اور دکھ تکلیف سے باہر نکل کر حوصلہ مندی اور عزم کی شمع روشن کرتا ہے۔غالبؔ نے تو یہ کہہ کر ہمت ہار دی تھی:

مضمحل ہو گئے قویٰ، غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں ۱۵

لیکن حیدر قریشی کا وژن کچھ اور کہہ رہا ہے:

''بڑھاپا بزرگی اور متانت عطا کرنے کے ساتھ زندگی کے تجربات کا نچوڑ نکال کر ایک رہنما کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔بڑھاپے میں گرگِ ظالم بھی پرہیزگار بن جاتا ہے اور یہ پرہیزگاری اُسے قویٰ کے اضمحلال اور زندگی کے تجربات کے نچوڑ کے بعد نصیب ہوتی ہے۔'' ۱۶

انشائیہ نگار کا ایک وصف یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ مشاہدے میں آنے والے حقائق اور مظاہر کے ایسے زاویوں کو بھی نمایاں کرے جو بالعموم ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں تاکہ نئے ادراکات کی روشنی میں اُس شے کے چھپے اَسرار کو سمجھا جا سکے۔حیدر قریشی نے یہ فریضہ عمدگی سے ادا کیا ہے۔اُن کا طرزِ بیان بڑی سے بڑی بات کو آسان اور موثر انداز میں پیش کر دیتا ہے۔اُن کی فکر پند ونصائح کے بجائے بے تکلف اُسلوب میں اظہار پاتی ہے۔

شہزاد منظر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''انشائیے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ انشا کا اعلیٰ نمونہ ہو،لہٰذا اچھی انشائیہ نگاری کے لیے تخلیقی زبان ضروری ہے،لیکن تخلیقی زبان سے مراد طنز ومزاح، لطائف یا پند ونصائح نہیں۔'' ۱۷

زندگی کی کھری اور حقیقی کیفیت کو اُسلوب اور تخیل کی تازہ کاری سے انشائیہ کا حصہ بنانا آسان بات نہیں ہوتا کیونکہ ایک آنچ کی کسر کسی انشائیے کو مضمون یا مقالے میں تبدیل کر سکتی ہے۔

حیدر قریشی نے انشائیہ نگاری کے جملہ تقاضوں کو نبھاتے ہوئے زندگی کی ایک اٹل حقیقت اور سچی جہت کو اس طرح اُجاگر کیا ہے کہ فکر کا جذبہ بڑھاپے کی محبت میں گھلتا نظر آتا ہے۔انشائیہ نگاری کا اصل حسن یہی ہے کہ تخلیقی اظہار ازلی وابدی سچائیوں کو بوجھل نہ بنائے بلکہ لطیف پیرائے میں اپنی بات دوسروں تک منتقل کر دے۔فنی وجمالیاتی اقدار کا پاس لحاظ انشائیے کی اولین ضرورت ہے۔

طنز ومزاح کی شرط انشائیے کے لیے لازمی نہیں ہے البتہ اگر یہ عناصر غیر محسوس طریقے سے اسلوب کا حصہ بن کر انشائیے کے قالب میں گھر کر لیں تو مزائقہ نہیں ہے۔زیرِ بحث انشائیہ سے ایک مثال درج کی جاتی ہے:

''انسان بچپن میں ضدی ہوتا ہے اور جوانی میں باغی۔لیکن بڑھاپے میں ضد اور بغاوت دونوں سے دامن چھڑا کر خود سپردگی اور راضی بہ رضا کے صوفیانہ مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔اولاد جتنی گستاخ، بے ادب اور بے پرواہوگی، اس صوفیانہ مقام میں انسان اتنا ہی ترقی کرتا جائے گا اور آخر اس مقامِ لاہوت تک جا پہنچے گا جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔'' ۱۸

یہ طنزِ ملیح ہے جس میں اصلاح کا کوئی پہلو چھپا ہوا نہیں ہے۔اور شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔انشائیہ نگار کا مقصد کسی کی اصلاح نہیں بلکہ قاری کو مسرت اور لطف کی کیفیت میں شریک کرنا ہے۔حیدر قریشی نے قاری کو مایوس نہیں کیا اور کسی قسم کی سنجیدگی کو بھی قریب نہیں آنے دیا جس کی وجہ سے اُن کا یہ انشائیہ تخلیقی اضطرار اور تخیلی اظہار کا باوقار حوالہ بن گیا ہے۔

منزہ یاسمین کہتی ہیں:

''حیدر قریشی اپنے اکثر انشائیے اُن موضوعات پر لکھتے ہیں جو اُن کے ذہنی، فکری اور جذباتی ردِعمل کا نتیجہ ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کا ہر انشائیہ اُن کے شخصی تجربے اور مشاہدے کا حامل نظر آتا ہے، وہ اپنے دل چسپ اور انوکھے تجربے میں قاری کو شریک ہی نہیں کرتے بلکہ ہم نوا اور ہم خیال بھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ۱۹

یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔بس اس میں اتنا اضافہ بھی کرلیا جائے کہ حیدر قریشی اپنے تمام موضوعات میں ذات و کائنات کے نئے اور منفرد روپ شگفتہ اور بے تکلف اسلوب میں پیش کرنے پر قادر ہیں تو بات جامع ہو جاتی ہے۔

(۳) فاصلے،قربتیں:

یہ انشائیہ کلیات میں شامل ہونے کے علاوہ ''اوراق'' ۲۰ میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے آغاز میں یہ شعر درج ہے:

جب سرکار کی جانب سے منظوری ہوتی ہے
فاصلہ کتنا بھی ہو عین حضوری ہوتی ہے ۲۱

حیدر قریشی نے انشائیے کی ابتدائی سطور میں بڑے دوستانہ انداز میں سرسبز و شاداب پہاڑوں کا ذکر کیا ہے جنہیں وہ روزانہ دور سے دیکھتے اور سراہتے ہیں اور پہاڑوں کی بلندی اور عظمت اُن کے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔لیکن جب وہ ایک دن پہاڑ کو نزدیک سے دیکھتے ہیں تو اُن کی رائے میں بڑی تبدیلی آ جاتی ہے:

''میں نے دیکھا کہ دور سے اتنا عظیم دکھائی دینے والا پہاڑ ایسے خوفناک ٹیڑھے میڑھے، رستوں اور ہولناک کھائیوں سے بھرا ہوا تھا جو سیدھا موت کے منہ میں لے جانے والی تھیں۔اِس کا دامن خونخوار جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔'' ۲۲

انشائیے کا یہ حصہ عمومی تجربات و مشاہدات کو رواں اُسلوب میں بیان کرتا ہے اور اُن کی نظر پہاڑ میں چھپے ولن کو بھی بخوبی دیکھ لیتی ہے:

''تب مجھے فاصلوں کا کمال معلوم ہوا۔جس نے پہاڑ کے اندر کے ولن کو

چھپا کر اُسے ہیرو کے روپ میں پیش کر رکھا تھا۔'' ۲۳

یہ انشائیہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس میں تفکر کے عناصر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور انشائیہ نگار بظاہر ایک عمومی مشاہدے سے انسانی نفسیات کے گہرے اور تیکھے اصول دریافت کرنے لگتا ہے:

''مجھے اندازہ ہوا کہ بڑے بڑے عظیم لوگ، پہاڑ جیسے عظیم لوگ، محض اس لئے عظیم لگتے ہیں کیونکہ ہم اُنھیں فاصلے سے دیکھتے ہیں۔۔۔جو لوگ انہیں قریب سے دیکھ لیتے ہیں اُن پر ان کی عظمت سے زیادہ ان کی شخصیت کے مخفی جوہر کھل جاتے ہیں، اس لیے وہ ان کی عظمت کے منکر ہو جاتے ہیں۔'' ۲۴

یہ وہ آنکھ ہے جو قطرے میں دجلہ دیکھنے پر قادر ہے۔جن تجربات کی روشنی میں یہ اُصول اخذ کیا گیا ہے اُن کی آفاقیت تشریح اور وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔آفتاب آمد دلیلِ آفتاب والی بات ہے۔اس نوع کی اصول سازی کوئی بہت حساس، دردمند اور ذہین شخص ہی کر سکتا ہے۔یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے گہرے احساس اور بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے۔

حیدر قریشی نے اُوپر جو اُصول وضع کیا تھا اب وہ اس کی مزید گرہیں کھولتے ہیں تاکہ انھوں نے جو استدلال قائم کیا تھا اُس کے نفسیاتی کوائف مع تشریحات و توضیحات مستحکم ہو جائیں:

''طویل فاصلے سے سورج جیسے چمکتے ہوئے لوگ اپنے اندر سورج سے بھی بڑا جہنم آباد کئے بیٹھے ہوتے ہیں۔یہ الگ بات کہ فاصلے پر بٹھائے ہوئے لوگوں کے لیے جنت کی بشارتیں نشر کرتے رہتے ہیں۔'' ۲۵

حیدر قریشی کی یہ نکتہ آفرینی مجاز کے رنگ میں ظاہر ہوتی ہے، جو استعارے کے پیرہن میں اپنا جادو جگا رہی ہے۔یہ انداز اگرچہ شاعرانہ ہے لیکن نکتہ آفرینی حکیمانہ ہے۔نذر خلیق اس ضمن میں ہماری رہنمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حیدر قریشی کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی کا عنصر فروانی سے ملتا ہے۔ان

کی نکتہ آفرینی ایک دو جملوں سے بہت کم ظاہر ہوتی ہے۔ اگر چہ ایسا ہوتا بھی ہے لیکن عموماً ایک پوری فضا کے بعد اُن کی بات کا بھید کھلتا ہے اور ان کی نکتہ آفرینی سے لطف لینے کے لیے اُس سطح تک جانا ضروری ہو جاتا ہے۔" ۲۶

حیدر قریشی کا یہ انشائیہ جہاں اور بہت سے تکنیکی اور فکری اوصاف کا حامل ہے وہاں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے انشائیے کے مرکزی اور ضمنی وقوعوں کے انتخاب و حذف کا بھی سلجھا ہوا شعور رکھتے ہیں۔ یہ انشائیہ اگر چہ مختصر ہے لیکن کسی واقعاتی یا فکری تشنگی کا احساس نہیں دلاتا بلکہ قدم قدم پر قاری کی قوتِ فکر کو متحرک کرتا چلا جاتا ہے۔ انشائیے میں کئی مقامات پر سماجی اور نفسیاتی رویوں کو سادگی مگر گہرائی میں جا کر دیکھنے کی جو سعی ملتی ہے وہ انشائیے کی معنوی خوبیوں کو منور کرتی ہے۔ یہ انشائیہ بھرپور تاثر کا حامل ہے اس انشائیے کا وہ حصہ بھی کافی تیکھا اور منفرد ہے جہاں وہ فاصلے اور قربتوں کے اَن دیکھے زاویے سامنے لا رہے ہیں:

"قربت آتشِ نمرود یا آتشِ محبت میں بے خطر کود پڑنے کا نام ہے جب کہ فاصلہ ہمیشہ محوِ تماشائے لبِ بام رہتا ہے بلکہ بعض اوقات لبِ بام سے بھی پرے کھڑا ہوتا ہے۔ اگر فاصلہ بھی اس آتش میں کود پڑے تو پھر فرقِ من و تُو ختم ہو جائے گا، فاصلہ ختم ہو جائے گا بس قربت ہوگی، یکتائی کا عالم ہوگا۔ اسے نیستی یا فنا بھی کہہ سکتے ہیں۔" ۲۷

یہ اقتباس قاری کو روحانی طور پر خاصا آسودہ کرتا ہے کیونکہ اب قرب اور فاصلے کا مفہوم روایتی اور عمومی مدار سے نکل کر روحانی مدار میں داخل ہو گیا ہے۔ انشائیہ نگار کی یہی ادا اور تخلیقی توانائی سوز و گداز کی کیفیات پیدا کرتی ہیں۔ اس قسم کے حقایق کو بیان کرنے کے لیے فنی بصیرت، عمیق مشاہدہ، کثیر الجہات تجربات و تجزیات اور جدت طرازی جیسے اوصاف درکار ہیں اور حیدر قریشی کے ہاں یہ عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں۔

(۴) وگ:

یہ انشائیہ کلیات میں شامل ہونے سے پہلے "اوراق" ۲۸ میں شائع ہو چکا تھا۔ کلیات میں طبع ہونے والے انشائیے کی پیشانی پر یہ شعر چمک رہا ہے:

یہ بال و پر تو چلو آ گئے نئے حیدرؔ
بلا سے پہلے سے وہ خال اور خد نہ رہے ۲۹

انشائیے کا آغاز تو والد کی یاد سے ہوتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس میں تاریخ اور سماجیات کے بڑے بڑے مسائل کا تذکرہ مخصوص انداز سے اپنی جگہ بناتا چلا جاتا ہے۔ حیدر قریشی جب سماج میں پوشیدہ خود غرضی اور مفاد پرستی پر بات کرتے ہیں تو یہ انشائیہ جو بظاہر وگ جیسی عام شئے پر لکھا ہوا ہے ایک مقام پر آ کر ایک پورے عہد کا المیہ بن جاتا ہے۔

جو لوگ وِگ پہننے والوں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ بہروپ بدلتے ہیں۔ اور بھیس بدل کر زندگی گذارتے ہیں اُن کے اس الزام کو حیدر قریشی نے رد کرتے ہوئے جواباً ایک اور اہم نکتے کی جانب ہماری توجہ دلائی ہے:

" بہروپ تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر کے شیطان کو مہارت کے ساتھ چھپا کر باہر فرشتہ بنا پھرے۔ مایا لگی ہوئی پگڑی کا اکڑا ہوا طرّہ، تکبر کی ماری ہوئی گردن، ریا کاری کی لمبی داڑھی اور نفیس جُبہ۔ یہ جُبہ و دستار بہروپ ہے۔ ایسے بہروپیوں کا یہ ساز و سامان اتار لیا جائے تو نیچے سے ن۔م۔راشد کا لا=انسان برآمد ہوتا ہے۔" ۳۰

حیدر قریشی کی شکوہ سنجی اپنی جگہ بجا ہے لیکن یہ اقتباس پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ صنفِ انشائیہ کے مجموعی مزاج سے قدرے تجاوز کر رہے ہیں۔ طنز کا استعمال انشائیے میں ممنوعات کی ذیل میں تو نہیں آتا لیکن اس کی غیر ضروری شدت اور کاٹ مذکورہ صنف کے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ صنفِ انشائیہ کے تقریباً تمام بڑے ناقدین مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، اکبر حمیدی، ڈاکٹر سلیم اختر، محمد ارشاد، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر رشید امجد، جمیل آذر، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اور حامد برگی وغیرہ نے طنز کی کاٹ اور مزاح کی شدت کو تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ غصہ یا برہمی کا اظہار انشائیے میں جگہ نہیں بنا سکتا بلکہ انشائیے کے مجموعی تاثر کو کمزور کر دیتا ہے۔

حیدر قریشی نے اس انشائیے میں جن مسائل پر بات کی اُن کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اگر اِن معاملات کو علامتی اور ڈھکے چھپے الفاظ میں پیش کر دیا جاتا ہے تو مجموعی تاثر پر خوشگوار

اثرات مرتب ہوتے ۔حامد برگی کا یہ کہنا درست ہے:

’’انشائیہ میں مقالہ کی طرح وضاحتوں کی گنجائش نہیں ۔ابہام اوایمائیت انشائیہ کا حسن ہے۔ بات جتنی اشاروں، کنایوں میں ہو اتنی ہی خوبصورت اور فنکارانہ ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ سوچ اور خیال کے دروازے کھولتی جائے۔انشائیہ نگار کا عندیہ مبہم ہونے کے باوجود قاری کی سمجھ میں آجائے،اُسے انشائیہ نگار سے وضاحتیں طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔‘‘ ۳۱

انشائیے کا اہم مقام یہی ہے کہ اس میں ایمائیت موجود ہواور وہ اظہار وابلاغ کے تمام تقاضے بھی پورے کرے۔حُسنِ معنی کا رکھ رکھاؤ اور پیش کش انشائیے کے بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں اگر ان کا اہتمام نہ کیا جائے تو بات نہیں بنے گی۔

انشائیے کے دو اور مقام ملاحظہ ہوں جہاں حیدرقریشی کا انشائی حوالہ قدرے دھیما ہو گیا ہے:

(ا)’’وہ لیڈر بہروپئے ہیں جو عوام کی فلاح کے دعوے کرتے ہیں اور عملاً عوام کا استحصال کرتے ہیں وہ لوگ بھی بہروپئے ہیں جو مغربی دنیا میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے من گھڑت اور جھوٹے بیانات دیتے ہیں کہ گوئبلز کی روح بھی شرما جائے۔‘‘ ۳۲

(ب)’’ادب میں بھی ایسے کئی بہروپئے پائے جاتے ہیں۔کسی مالدار ادیب سے دولاکھ روپئے کھا کر اُسے ۲۵ ہزار روپئے کا انعام دلانے والے۔‘‘ ۳۳

یہ باتیں پڑھ کر دل کو طمانیت اور راحت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اصلاح اور سنجیدگی کا تاثر ابھرتا ہے،شہزاد منظر نے کہا تھا:

’’انشائیے کی صنف شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے انشائیہ نگار کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا۔کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد کے لئے کارآمد ہوتی ہے۔‘‘ ۳۴

انشائیہ کبھی اصلاحی مقاصد کی خاطر نہیں لکھا جاتا کیونکہ اس کے لئے مضمون کی صنف پہلے سے موجود ہے جو اسلوبیاتی اور موضوعاتی اعتبار سے خاصی وسعت کی حامل ہے۔ انشائیے میں

اکتاہٹ اور طنز کی موجودگی قاری کو مغالطے میں مبتلا کر سکتی ہے۔اگر مضمون اور انشائیے میں اس فرق کے نظرانداز کر دیا جائے تو پھر بات نہیں بنے گی۔

حیدرقریشی کے انشائیوں پر مجموعی رائے:

گذشتہ صفحات میں حیدرقریشی کے چار اہم انشائیوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کر کے اُن کے مجموعی رنگ کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔موجودہ سطور میں اُن کے باقی انشائیوں (نقاب، اطاعت گزاری، یہ خیر وشر کے سلسلے، چشم تصور، اپنا اپنا سچ تجربہ اور تجربہ کاری) کو بھی مدِنظر رکھ کر سلسلہء کلام آگے بڑھایا جائے گا تاکہ اُن کے فکر ونظر کے ممکنہ پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکے۔ حیدرقریشی کی انشائیہ نگاری کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن میں درج ذیل نکات حاوی دکھائی دیتے ہیں۔

ا۔انشائیے کا ابتدائی شعر:

حیدرقریشی نے اپنے ہر افسانے اور انشائیہ کا آغاز ایک شعر سے کیا ہے۔اس شعر کا منطقی جواز یہی ہے کہ ہر شعر مرکزی موضوع پر مبنی ہے۔اور ہر موضوع میں زیرِ بحث اَن کہی باتیں شعر کی زبانی بیان ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام اشعار طبع زاد ہیں اور موضوع کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً ’’نقاب‘‘ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

حیدر بھید جہاں کے جیسے خواب کے اندر خواب
ایک نقاب اگر الٹیں تو آگے اور نقاب ۳۵

یہ انشائیہ پڑھ چکنے کے بعد قاری محسوس کرنے لگتا ہے کہ جیسے حیدرقریشی نے اس مضمون کو پھیلا کر انشائیہ بنا دیا ہے یا انشائیے کے موضوع کو سمیٹ کر شعر میں بند کر دیا ہے

’’وِگ‘‘ کا ابتدائی شعر دیکھئے:

یہ بال و پر تو چلو آگئے نئے حیدر ے ے

بلا سے پہلے سے وہ خال اور خد نہ رہے ۳۶؎

انشائیہ ''یہ خیر وشر کے سلسلے'' کا شعر دیکھئے:

خیر و شر کی آمیزش اور آویزش سے نکھریں

بھول اور توبہ کرتے سارے سانس بسر ہو جائیں ۳۷؎

غرض ہر شعر پیش آمدہ صورتِ حال کا جامع مرقع ہے۔

۲۔تفکر کے عناصر:

ڈاکٹر ناصر عباس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''انشائیہ انسان کی ذہنی اور تہذیبی ترقی کے ایک مرحلے پر نمودار ہوتا ہے۔'' ۳۸؎

یہی ذہنی اور تہذیبی ترقی انشائیے میں فکریات کے ایسے عناصر پیدا کرتی ہے جن کا مطالعہ حیات و کائنات کی تفہیم میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ حیدر قریشی کے انشائیوں میں فکری اکائیاں دھیمے سروں میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ اگر کہیں تخلیقی رو میں سروں کی آواز اونچی ہونے لگے تو انشائیہ نگار شعوری کاوش سے انھیں پھر سے دھیما بنا دیتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

انشائیہ ''اطاعت گزاری'' میں کہتے ہیں:

''اطاعت گزاری کا جوہر نہ صرف بغاوت، سرکشی اور انحراف کے جذبات کو ختم کرتا ہے بلکہ انسانی ذہن کو زیادہ سوچنے کے عمل سے روک کر اُسے بہت سی مشکلات سے بھی نجات بخش دیتا ہے۔ زیادہ سوچنے والے لوگ یعنی آزادانہ طور پر غور و فکر کرنے والے لوگ جب سوچتے ہیں بُرے بھلے میں حدِ فاصل قائم کر کے تعصب اور آویزش کو ہوا دینے لگتے ہیں۔'' ۳۹؎

اس طرح کے فکری تصورات اور تجربات کا کوئی اپنا سیاق و سباق بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ اپنے سیاق سے ہٹ کر بھی سماجی المیے کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اقتباس میں موجود تمام الفاظ سادہ و سہل نظر آتے ہیں لیکن ان میں فکری پیچیدگی موجود ہے۔ جو قاری کی توجہ چاہتی ہے۔ اگرچہ انشائیہ کا مقصد تلخ نوائی نہیں ہوتا اور نہ پڑھنے والوں کو کسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا کرنا ہے بلکہ یہ

موضوع کا کمال ہے کہ وہ اپنے اندر چھپے ابعاد اور جہات کبھی سنجیدگی اور کبھی خوشی یا مسرت کے پیرائے میں کھولتا چلا جاتا ہے اور انشائیہ نگار تخلیقی بہاؤ میں بہتا چلا جاتا ہے۔

ایک اور انشائیہ ''فاصلے، قربتیں'' کا یہ جملہ دیکھئے۔

''قربت کی انتہا سے فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح فاصلے کی انتہا قربت کو جنم دیتی ہے یہ کوئی فلسفہ نہیں حقیقت ہے۔'' ۴۰؎

''تجربہ اور تجربہ کاری'' ایک ایسا انشائیہ ہے جس میں حیدر قریشی نے ''تجربہ'' کو ایجابی اور ''تجربہ کاری'' کو سلبی اوصاف کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ اور اپنے اس نقطۂ نظر یا موقف کو منطقی استدلال سے مزین کر دیا ہے۔ یہ جملے لائقِ توجہ ہیں:

۱۔ ''تجربہ کاری کا یہ اصول ہے کہ جو چیز اپنے مطلب اور فائدے کے مطابق ہے وہی سچائی ہے باقی سب جھوٹ ہے۔'' ۴۱؎

۲۔ تجربہ کاری کا ہنر جاننے والوں کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اپنے واجبی علم کی خامیوں کو چھپا کر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے علم کا اظہار کریں گے۔'' ۴۲؎

۳۔ ''زندگی کے تجربات زندگی کو معصومانہ حیرت سے دیکھنے اور پھر اس کی جستجو کے سفر سے عبارت ہیں یہ حیرت اور جستجو اجتماعی نوعیت کی ہے، کیونکہ اس سے پوری انسانیت فیض یاب ہوتی ہے۔'' ۴۳؎

حیدر قریشی کے انشائیوں میں فکریات کا ایک پورا نظام فعال ہے۔ اس نظام کا مرکز و محور اخلاقیات پر استوار ہے جس میں ایک طرف تو نام نہاد پاکبازوں کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے اور دوسری جانب سماجی رویوں میں چھپے کذب و افترا اور منافقت کا پردہ چاک کیا جاتا ہے لیکن تنقید کا یہ عمل صنفِ انشائیہ کے مزاج کو متاثر نہیں ہونے دیتا۔

۳۔اصول اخذ کرنے کی صلاحیت:

حیدر قریشی کے انشائیوں میں سچی، کھری اور جرآت مندانہ باتوں کا سلسلہ در سلسلہ بیان ملتا ہے۔ یہ بیان قاری کے تجربات میں خوشگوار اضافہ کرتا ہے اور اسے کئی مقامات پر چونکاتا

بھی ہے۔"فاصلے،قربتیں" میں شامل تمام انشائیوں کا ایک نمایاں وصف یہ سامنے آتا ہے کہ حیدر قریشی نے جن حالات و واقعات کو موضوع بنایا اُن پر بات کرتے ہوئے مخصوص نتائج اور اصول اخذ کرتے ہیں۔

یہ اصول وہ ثمرات ہیں جو قاری کی فکری اور جمالیاتی ترتیب کرتے ہیں۔اس ضمن میں کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں:

ا۔"اگر ہر شئے بے نقاب ہوتی تو کسی شئے میں کوئی جاذبیت نہ رہتی۔"

(نقاب) ۴۴؎

۲۔"ہر سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ اور ہر جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہوتا ہے۔" (یہ خیر وشر کے سلسلے) ۴۵؎

۳۔"ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہوتا ہے۔اور ہر کسی کو اپنے اپنے سچ کی حفاظت کرنی چاہئے۔نظریاتی سچ کی حفاظت نظریات پر عمل پیرا ہونے سے ہوتی ہے۔" (اپنا اپنا سچ) ۴۶؎

۴۔"یہ وہی تجربہ کاری ہے جو اپنی عیاری کو حکمت اور دوسروں کی دفاعی حکمت کو بھی مکاری قرار دیتی ہے۔"

(تجربہ اور تجربہ کاری) ۴۷؎

۴۔تجربات اور مشاہدات اور تجزیات

حیدر قریشی نے اپنے تقریباً تمام انشائیوں میں زندگی سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات کو بہ اندازِ دگر پیش کیا ہے۔یہ تجربات و مشاہدات اگرچہ انفرادی سطح سے اُٹھتے ہیں لیکن فنی چابکدستی اور انشائی تخلیقی عمل کی بدولت اجتماعی رنگوں سے مالا مال ہیں۔کچھ رنگ ملاحظہ ہوں:

"یہ ڈپلومیٹس (امریکی) دنیا بھر میں جمہوریت کے نفاذ کے علمبردار ہیں۔ لیکن اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے بعض ممالک میں نہ صرف بادشاہت کو تحفظ فراہم کرتے

ہیں بلکہ جہاں اپنا فائدہ نظر آئے وہاں جمہوریت کا خاتمہ کر کے فوجی آمریت بھی مسلط کر دیتے ہیں۔" ۴۸؎

"اصولاً کسی کو اپنی خوبصورتی کے ثبوت کے لیے دوسروں کی بدصورتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔" ۴۹؎

"سچے اطاعت گذار کا کمال یہ ہے کہ جو سانحہ اُس کے اپنے گروہ کے ساتھ پیش آئے اُسے تو وہ خدا کی طرف سے آزمائش اور امتحان قرار دیتا ہے لیکن اگر ویسا ہی سانحہ بلکہ اس سے بھی کم تر سانحہ کسی دوسرے گروہ کو پیش آئے تو پورے ایمانی جوش وخروش کے ساتھ اُسے عذابِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔" ۵۰؎

غرض ان کے انشائیوں کا عمرانی پہلو اصل سائل کو نشان زد کرتا ہے۔

(۵) سائنسی عناصر:

حیدر قریشی کو سائنسی علوم خصوصاً طبیعیات میں خاص دلچسپی ہے اور اس کی وجہ ڈاکٹر وزیر آغا کی دوستی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔آغا صاحب کے اکثر قریبی دوست اس مشترک شوق کے اسیر ہیں۔حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں کئی مقامات پر اپنے اس شوق کا اظہار کیا ہے۔مثلاً اُن کا انشائیہ "چشم تصور" ایٹم (Atom) کے جدید تصورات پر روشنی ڈالتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے ایٹم کی اندرونی ساخت پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پہلے پہل کہا گیا کہ ایٹم مادے کا بلڈنگ بلاک ہے بعد میں اسی ایٹم کے چالیس سے زائد پارٹیکلز دریافت ہو گئے۔ بات Quarks تک پہنچی مگر پھر اس کے بھی مزید چھ کلرز سامنے آ گئے۔Quarks سے "ہیڈرونز" بنتے ہیں۔" ۵۱؎

"سائنس ابھی تک چھوٹی کائنات یعنی ایٹم کا کوئی انت تلاش نہیں کر سکی۔" ۵۲؎

حیدر قریشی نے اپنے انشائیے میں ان تمام مسائل سے اُس وقت تعرض کیا جب وہ تخلیق کائنات پر غور و فکر کر رہے تھے اور وہ لاشعوری طور پر تخلیق اور ایٹم کے باہمی تعلق پر سوچنے لگ گئے۔انھوں نے نظامِ شمسی اور کائنات کے دیگر مظاہر کو بلیک ہولز کے تناظر میں بھی سمجھنے کی

سعی کی ہے۔ان کا چشمِ تصور اگر ایک طرف سائنس جیسے جدید ترین نظریات سے روشنی حاصل کرتا ہے تو دوسری جانب جن، دیو، پریاں، اور اڑن کھٹولے اُن کے تخیلات کو مہمیز کر رہے ہیں۔

اُن کا ایک اور انشائیہ ''فاصلے اور قربتیں'' جب تخلیقی امکانات کو زیرِ بحث لاتا ہے تو Big Bang پارٹیکل اور اینٹی پارٹیکل کے تصورات کو بھی اپنے موضوع میں سموتا چلا جاتا ہے۔یہ تمام سائنسی حوالہ جات محض سائنسی معلومات فراہم نہیں کرتے بلکہ کائنات کے اسرار و رموز کو بھی تخیل کی آنکھ سے دیکھنے کے لیے زمین ہموار کرتے ہیں۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے جو بات انشائی اسلوب کے حوالے سے کہی تھی یہ اس کی عملی صورت ہے، اُنھوں نے کہا تھا:

''انشائیہ نگار اُسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتا ہے، مراد یہ ہے کہ وہ روایتی اور مروجہ اسلوب اظہار کے لیے نئے امکانات کا سراغ لگاتا ہے۔'' ۵۳

سائنسی موضوعات عموماً اپنی خشکی اور معروضی صفات کی بنا پر ادب میں مشکل سے ہی جگہ بنا پاتے ہیں لیکن حیدر قریشی جیسے پختہ کار انشائیہ نگار اپنے جاندار تخیل کی بدولت ان میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔

۶۔ادبی مشاہدات اور تجربات

حیدر قریشی کی زندگی کا بڑا حصہ ادبی مصروفیات کے تابع ہے۔لہٰذا ادبی باتوں کا انشائیے یا دوسری نثری اصناف میں در آنا خلافِ توقع نہیں ہے۔انھوں نے اپنے انشائیوں میں تلخ ادبی تجربات کا تذکرہ کومل سروں میں کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں:

''دبیز نقاب جب کسی معقول انسان کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ عاشقِ زار بن کر محلے کے شرفا کے لیے متعدد مسائل پیدا کر دیتا ہے۔لیکن جب یہی نقاب کسی ادیب کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ بے سروپا نظمیں یا مضمون نما خط قسم کی چیزیں لکھ کر اپنے آپ میں ایک مسئلہ بن جاتا ہے، شاید نفسیاتی مسئلہ!'' ۵۴

انشائیہ ''وگ'' میں جب بہروپ بدلنے والوں کا ذکر آتا ہے تو حیدر قریشی کا قلم خود بخود ادب کی جانب مڑ جاتا ہے:

''ادب میں بھی ایسے کئی بہروپیے پائے جاتے ہیں۔کسی مالدار ادیب سے دو لاکھ روپے کھا کر اُسے ۲۵ ہزار روپے کا انعام دلانے والے، مناسب حق الخدمت کے طور پر کسی لولے لنگڑے افسانے کو دورِ حاضر کا ممتاز ترین افسانہ قرار دینے والے۔'' ۵۵

ان ادبی مسائل و عوارض کا پس منظر چاہے کچھ بھی ہو حیدر قریشی اِن میں عمومیت کا رنگ بھر کر یاراں نکتہ دان کو صلاحِ عام کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔اِن واقعات اور تجربات کی شمولیت کا ایک حسن یہ ہے کہ اصل موضوع کی مرکزیت کو قائم رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں ایسی کر جاتے ہیں جو بادی النظر میں اصل موضوع سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں لیکن اصل موضوع کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔یہ انشائی اسلوب ہی کا وصف ہے کہ موضوع کی وسعت حسبِ ضرورت بڑھائی یا کم کی جاسکتی ہے۔بقولِ غالب!

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے ۵۶

۷۔نفسیات، مشاہدۂ باطن اور اخلاقیات:

انسانی نفسیات اور مشاہدۂ باطن سے حیدر قریشی کو جو غیر معمولی دل چسپی ہے اس کا اندازہ اُن کی یادنگاری، خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری، سے بآسانی ہو جاتا ہے، لیکن انشائیہ نگاری میں بھی یہ عناصر جگہ جگہ مشاہدہ کیئے جاسکتے ہیں۔اس حوالے سے چند مثالیں دیکھئے:

''بچپن میں ہم جوانوں کو دیکھ کر جوان ہونے کی تمنا کرتے ہیں لیکن جوان ہوتے ہی بچپن کو یاد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔اس کے برعکس جوانی میں ہم آنے والے بڑھاپے کے تصور سے ہی خوف کھاتے ہیں۔لیکن بڑھاپا آتے ہی ہم پر فکر و دانش کے ایسے انوار برستے ہیں کہ نہ صرف بڑھاپے سے سارا خوف دور ہو جاتا ہے۔ بلکہ ہماری زندگی میں ہی بڑھاپا ہمیں بچپن اور جوانی ہمارے بیٹوں اور پوتوں کی صورت میں دکھا دیتا ہے۔'' ۵۷

نفسیاتی ژرف بینی کی یہ مثال بھی دیکھئے:

’’انسانی چہرہ بجائے خود ایک نقاب ہے جس میں سے کبھی کبھی اس کے اندر کا حیوان جھانکتا نظر آتا ہے۔اندر کا فرشتہ تو اکثر چہرے پر ہی ملتا ہے کون ہے جو کسی دوسرے انسان کو پوری طرح جاننے کا دعویٰ کر سکے۔‘‘ ۵۸؎

مشاہدہ باطن کی مثال ملاحظہ ہو:

’’اطاعت گزاری،فرمانبرداری اور وفا شعاری ایک ہی حقیقت کے مختلف چہرے ہیں۔اطاعت کا مادہ انسانی نفس کو سنگسار کر کے اس کی روح اور ذہن کو ہر طرح سے سبک سار کر دیتا ہے۔گویا اطاعت سے مراحلِ تصوف کا آغاز ہوتا ہے اور کمالِ اطاعت تک وہ کامل صوفی بن جاتا ہے۔‘‘ ۵۹؎

حیدر قریشی کا تخلیقی وجدان،سماج،افراد،وقوعات،حوادث اور انسانی مظاہر کے باطن میں چھپے اُس اسرار کو ڈھونڈ نکالتا ہے جو عام نظر سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔حیدر قریشی کے انشائیوں میں اخلاقیات کا عنصر خاصا نمایاں ہے۔جس طرح اقبال کے بارے میں عموماً یہ شکوہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی غزلوں اور نظموں میں جس کسی موضوع پر بات کریں بالآخر گھوم پھر کر اپنے فلسفۂ خودی یا فلسفۂ عشق کا الاپ شروع
کر دیتے ہیں۔تقریباً ایسی ملتی جلتی صورت حیدر قریشی کے انشائیوں میں نظر آتی ہے،وہ موقع ملتے ہی نصیحت کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔یہ مثال دیکھئے:

’’ایک اچھے مرد کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی بیوی پر قناعت کرے۔دوسروں کی بیویوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی بجائے اپنے اور اپنی بیوی کے مشترکہ تخلیقی عمل میں مگن رہے اور اس طرح زندگی میں اضافہ کر کے زندگی کی جنت کا نظارہ کرتا رہے۔‘‘ ۶۰؎

گو اُن کے ہاں پند و نصائح والی روایتی کیفیت تو پیدا نہیں ہوتی لیکن دبے لفظوں میں وہ کوئی نہ کوئی ایسا اخلاقی نکتہ ضرور بیان کرتے ہیں جو قاری کی فکری تربیت میں معاونت کرتا ہے۔حیدر قریشی قاری کے بنیادی عقائد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عمومی نکتوں پر بات کرتے ہیں

تا کہ ہر شخص حسبِ حال اُن سے مستفید ہو سکے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عقائد اور نظریات کا ہر نظام عمرانی شعور کا زائیدہ ہوتا ہے اور اس کی نشو ونما اور ارتقا کا سلسلہ اُس وقت مزید مستحکم ہو جاتا ہے جب حیدر قریشی جیسا قلم کار اپنی ذمہ داری پوری کرتا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

’’میری انشائیہ نگاری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بہت بڑا حصہ ہے۔باقی انشائیہ نگاروں میں غلام جیلانی اصغر،انور سدید،مشتاق قمر اور اکبر حمیدی مجھے اچھے لگتے ہیں۔شاید ان کے اثرات بھی میرے انشائیوں میں ملتے ہیں۔‘‘ ۶۱؎

حیدر قریشی کا یہ اعتراف خاص اہمیت رکھتا ہے،اور ان کے اثرات کا کھوج بھی بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔اُنھوں نے جن شخصیات کا حوالہ دیا ہے ان میں تین پر وہ خاکے بھی لکھ چکے ہیں۔جو’’میری محبتیں‘‘ کے حصہ دوم میں بعنوان عہد ساز شخصیت (ڈاکٹر وزیر آغا)،ایک ادھورا خاکہ (غلام جیلانی اصغر)،اور بلند قامت ادیب (اکبر حمیدی) دیکھے جا سکتے ہیں۔ دبستانِ سرگودھا کے یہ تینوں ادیب انشائیہ نگاری کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔حیدر قریشی نے وزیر آغا والے خاکے میں ایک بار پھر اس بات کا اعتراف کیا کہ

’’وزیر آغا نے مجھے انشائیے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔‘‘ ۶۲؎

اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدر قریشی کی زیادہ ملاقاتیں اور مکتوبی رابطے وزیر آغا سے رہے اور آغا صاحب انشائیہ کے بارے میں جو بصیرت افروز نظریات رکھتے تھے وہ مجموعی صورت میں ان کے لیے بھی قابلِ قبول تھے۔’’فاصلے،قربتیں‘‘ میں موجود انشائیے جہاں ان مقتدر شخصیات کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں وہاں حیدر قریشی کی تخلیقی صلاحیت اور سلیقہ شعاری کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے کہا تھا:

’’انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتا ہے،مراد یہ ہے کہ وہ روایتی اور مروجہ اسلوبِ اظہار کے نئے امکانات کا سراغ لگاتا ہے۔کثرتِ استعمال سے جو ترکیب،محاورے،استعارے اپنی چمک دمک کھو چکے ہیں،انہیں نئے سیاق وسباق میں پیش کرتا ہے اور

اس عمل میں وہ ’’روایت‘‘ کو نئی سطح تفویض کرنے کی انشائی ٹیکنیک کے تابع رہتا ہے، اگر وہ اسلوب کی تازگی کو بروئے کار نہ لا سکے تو اس کا انشائی تخلیقی عمل سے گزرنا مشتبہ قرار پائے۔‘‘ ۶۳

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں مذکورہ بالا تمام شرائط کا التزام بطریقِ احسن کیا ہے۔اور ویسے بھی اِن کا تعلق انشائیہ نگاروں کے اُس قبیلے کے ساتھ ہے جن کی نشو ونما براہِ راست اُن ادیبوں کے زیرِ سایہ ہوئی جو فنِ انشائیہ نگاری کے امام اور بنیاد گزار ہیں۔یہ اُنہی کی تربیت اور حیدر قریشی کی ذاتی محنت کا فیض ہے کہ آج اُن کا شمار اردو ادب کے اہم انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

حوالاجات

۱ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۵۲۶
۲ اکبر حمیدی، جدید اردو انشائیہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء ، ص۴۔(ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ حوالہ مذکورہ کتاب کے دیباچے سے اخذ کیا گیا ہے، جو اکبر حمیدی کا تحریر کردہ ہے)
۳ جدید اردو انشائیہ، ص ۶
۴ جدید اردو انشائیہ، ص ۹ (دیباچہ از اکبر حمیدی)
۵ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو انشائیہ کی کہانی، مشمولہ، جدید اردو انشائیہ، مرتبہ، اکبر حمیدی، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آبا، ۱۹۹۱ء، ص۲۴
۶ حیدر قریشی، فاصلے، قربتیں، مشمولہ عمرِ لاحاصل کا حاصل، (کلیات نظم ونثر)،
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء ،ص ۵۰۷
۷ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، انشائیہ کیا ہے،

مشمولہ، سہ ماہی اوراق، جولائی، اگست ۱۹۹۹ء (خاص نمبر) ص ۱۷۹
۸ خاموشی، مشمولہ، عمرِ لاحاصل کا حاصل، ص ۵۰۷
۹ ایضاً، ۵۰۸
۱۰ اکبر حمیدی، اردو انشائیہ اور نئے افق،
مشمولہ، سہ ماہی اوراق، جولائی اگست ۱۹۹۹ء، (خاص نمبر)، ص ۱۷۸۔۱۷۷
۱۱ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ، مبادیات ،مشمولہ، جدید اردو انشائیہ
۱۲ خاموشی، کلیات، ص ۵۰۹
۱۳ جمیل آذر، انشائیہ نگار کا رویہ،
مشمولہ، اوراق، اگست، ستمبر (خاص نمبر) ، شمارہ ۸، ۹ ص۳۷۵
۱۴ حیدر قریشی، بڑھاپے کی حمایت میں،
مشمولہ، جدید اردو انشائیہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۱۴۸
۱۵ غالب، دیوانِ غالب، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن اشاعت ندارد، ص ۱۱۹
۱۶ بڑھاپے کی حمایت میں، مشمولہ، جدید اردو انشائیہ، ص۱۵۰
۱۷ شہزاد منظر، ردِ عمل (تنقیدی مضامین)، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۹
۱۸ بڑھاپے کی حمایت میں، ص ۱۵۰
۱۹ منزہ یاسمین، حیدر قریشی۔شخصیت اور فن،
میاں محمد بخش پبلیشرز، خانپور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۶
(یہ اصل میں ایم اے کا تحقیقی مقالہ ہے، جو ڈاکٹر شفیق احمد کی نگرانی میں مکمل ہوا، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور، شعبہ اردو کی طالبہ نے یہ مقالہ ۲۰۰۰ء، تا ۲۰۰۲ کے سیشن میں لکھا تھا ،مقالہ ہذا با قاعدہ منظوری کے بعد کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا)
۲۰ حیدر قریشی، فاصلے، قربتیں، اوراق (سالنامہ)، مدیر ڈاکٹر وزیر آغا،
شمارہ نمبر۲،۳، فروری، مارچ ۱۹۹۵ء ص ۳۳۲ تا ۳۳۳

۲۱ یہ شعر،کلیات، (عمرِ لاحاصل کا حاصل) کے صفحہ ۵۱۶ پر چھپنے والے انشائیے میں تو شامل ہے،لیکن اوراق میں چھپنے والے اس انشائیے میں شعر کو حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۲ حیدرقریشی، فاصلے، قربتیں، اوراق، مدیر ڈاکٹر وزیر آغا،
شمارہ نمبر۲،۳، فروری،مارچ ۱۹۹۵ء ص۳۳۲

۲۳ فاصلے، قربتیں، ص ۳۳۲

۲۴ ایضاً

۲۵ ایضاً

۲۶ نذرِ خلیق،حیدرقریشی کے انشائیے، مشمولہ، حیدرقریشی کی ادبی خدمات،
(متفرق مضامین)۔میاں محمد بخش پبلشرز، خانپور، ۲۰۰۳ء، ص۲۴۵

۲۷ فاصلے قربتیں، ۳۳۲

۲۸ حیدرقریشی، وگ(انشائیہ) ،مشمولہ اوراق، شمارہ ۱، ۲،
جنوری، فروری، ۱۹۹۶ء ، ص ۵۵ تا ۵۶

۲۹ عمرِ لاحاصل کا حاصل (کلیاتِ نظم و نثر)، ص ۵۱۳

۳۰ ایضاً ، ص ۵۱۴

۳۱ حامد برگی، انشائیہ کا فن، مشمولہ، جدید اردو انشائیہ، ص ۸۵

۳۲ وگ، ص ۵۱۵

۳۳ ایضاً

۳۴ شہزاد منظر، ردِ عمل، (تنقیدی مضامین) ص ۱۷۸

۳۵ نقاب، مشمولہ عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات نظم و نثر) ص ۵۱۰

۳۶ وگ، مشمولہ، عمرلاحاصل کا حاصل (کلیات نظم و نثر) ص ۵۱۳

۳۷ یہ خیروشر کے سلسلے،مشمولہ،عمرِ لا حاصل کا حاصل،(کلیات نظم ونثر)ص ۵۲۵

۳۸ ناصرعباس نیر ، نئے انشائیہ نگاروں کا شعورِ تخلیق، مشمولہ، ادبیات،

اکادمی ادبیات پاکستان، جلد۱۳ ، شمارہ۵۳، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۳

۳۹ اطاعت گزاری، مشمولہ، عمرِ لاحاصل کا حاصل، ص ۵۲۴

۴۰ فاصلے قربتیں، مشمولہ عمرِ لاحاصل کا حاصل، ص ۵۱۸

۴۱ تجربہ اور تجربہ کاری، عمرِ لاحاصل کا حاصل، ص ۵۳۵

۴۲ تجربہ اور تجربہ کاری، عمرِ لاحاصل کا حاصل، ص ۵۳۵

۴۳ ایضاً، ص ۵۳۴

۴۴ نقاب، عمرِ لاحاصل کا حاصل، ص ۵۱۱

۴۵ یہ خیر و شر کے سلسلے، مشمولہ، عمرِ لاحاصل کا حاصل ، ص ۵۲۷

۴۶ اپنا اپنا سچ، مشمولہ، عمرِ لاحاصل کا حاصل، ص ۵۳۱

۴۷ تجربہ اور تجربہ کاری ، مشمولہ، عمرِ لاحاصل کا حاصل ، ص ۵۳۵

۴۸ تجربہ اور تجربہ کاری ، ص ۵۳۵

۴۹ اپنا اپنا سچ، مشمولہ، کلیات ، ص ۵۳۱

۵۰ اطاعت گزاری، مشمولہ، کلیات ، ص ۵۲۲

۵۱ چشمِ تصور، مشمولہ، کلیات، ص ۵۲۹

۵۲ ایضاً

۵۳ ناصرعباس نیر، نئے انشائیہ نگاروں کا شعورِ تخلیق، ص ۱۸۴

۵۴ نقاب، کلیات، ص ۵۱۲

۵۵ وگ، کلیات، ص ۵۱۵

۵۶ غالب، دیوانِ غالب، ص ۱۸۲

۵۷ بڑھاپے کی حمایت میں، کلیات، ص ۵۲۰

۵۸ نقاب، کلیات، ص ۵۱۰، ۵۱۱

۵۹ اطاعت گزاری، مشمولہ، کلیات ، ص ۵۲۲

۶۰؎ اپنا اپنا سچ، مشمولہ، کلیات ، ص ۵۳۲
۶۱؎ حیدرقریشی سے لئے گئےانٹرویوز، مرتب سعید شباب،
نظامیہ آرٹ اکیڈمی،ایمسٹرڈیم،ہالینڈ
(یہ انٹرویو محمدوسیم انجم نے کیا تھا، مذکورہ کتاب میں یہ انٹرویو
''حیدرقریشی سے مکالمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔)
۶۲؎ عہدساز شخصیت(ڈاکٹروزیرآغا)، کلیات، ص ۳۳۶
۶۳؎ ناصرعباس نیر، نئے انشائیہ نگاروں کاشعورِتخلیق، ص ۱۸۴

صرف گناہوں کا ہی بوجھ نہیں سر پر
اپنے نیک اعمال بھی ہم کوڈھونے ہیں

خاموشی

گیت سناتے ہیں جھرنے کے گرنے کا
حرف جو خاموشی کی صدا میں گرتے ہیں

ہنگامہ اور شور زندگی کے صحیح عکاس نہیں۔اسی طرح سنّاٹا اور ویرانی بھی زندگی کے ترجمان نہیں ہیں۔ان کے برعکس خاموشی زندگی کی حقیقی عکاسی کرتی ہے۔جو لوگ سنّاٹے اور خاموشی میں فرق نہیں کر پاتے وہ خاموشی کی اہمیت نہیں جان سکتے۔سنّاٹا بے روح اور بے آواز ہوتا ہے جبکہ خاموشی زندگی کی عکاس ہی نہیں، زندگی کو جنم بھی دیتی ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟۔دل کی دھڑکن کا ہر بار ایک وقفے کے ساتھ خاموشی اختیار کرنا اور پھر خاموشی کے اسی وقفے سے اگلی دھڑکن کا جنم لینا زندگی کو جنم دینا نہیں تو اور کیا ہے! پھر خاموشی سنّاٹے کی طرح بے آواز بھی نہیں بلکہ خاموشی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔جب مکمل خاموشی ہو، ہونٹ بھی خاموش ہوں تب دو دھڑکتے دلوں کی جو گفتگو ہوتی ہے اسے اہلِ دل بخوبی جانتے ہیں۔کوئی صوفی جب تک کسی گوشۂ خاموشی میں نہ جائے تب تک اس کے دل کے تار حقیقتِ عظمٰی سے نہیں مل پاتے۔کسی ہنگامہ خیز، پُرشور ماحول نے نہ کبھی دو سچے دلوں کو ملنے دیا ہے اور نہ کبھی کوئی سچا صوفی پیدا کیا ہے۔عبادت گاہوں میں جب تک خاموشی نہ ہو عبادت کا لطف ہی نہیں آسکتا، یوں بھی خاموشی بجائے خود عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب سے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال عام ہوا ہے، عبادت گاہوں میں بھی شور سنائی دینے لگا ہے اور عبادتوں کا تقدس ختم ہوتا جارہا ہے۔

عبادت کی حیثیت سے خاموشی وظیفۂ ردِّ بلا بھی ہے۔ایسا قرض خواہ جو دو سال سے

پھیرے لگانے کے بعد یہ ارادۂ بدلے کر آئے کہ آج حتمی فیصلہ کر کے جاؤں گا یا ایسا مالک مکان آئے جو گزشتہ چھ سات ماہ کا کرایا یکمشت لینے کی شر انگیزی پر تُلا بیٹھا ہو، ایسے لوگ جب ایسے بدارادوں سے آتے ہیں تو گالی گلوچ سے بھی دریغ نہیں کرتے لیکن ان کے ہر شر سے بچنے کے لئے خاموشی سب سے بہتر وظیفہ ہے۔ایسے ابتلا کے موقع پر آپ دل ہی دل میں ''جوابِ جاہلاں باشد خموشی'' کا وِرد بھی کر سکتے ہیں۔اگر غلطی سے آپ یہ وِرد با آوازِ بلند کر بیٹھتے ہیں تو اسی وقت آپ کو خود احساس ہو جائے گا کہ خاموشی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی آپ پر عملی صورت میں منکشف ہوگی کہ جاہلانہ کلام سے خاموشی بہتر ہے۔

آواز کی دلکشی بھی خاموشی کے پس منظر کی محتاج ہے۔ہوٹلوں اور بازاروں میں پوری آواز کے ساتھ نشر کئے جانے والے گیت سَر میں درد پیدا کر دیتے ہیں جبکہ وہی گیت آپ رات کو مکمل خاموشی کے پس منظر میں مدھم آواز سے سُنیں تو آپ خود بھی ان گیتوں کے سُروں کے ساتھ جیسے بہتے چلے جائیں گے۔سرگوشی اور دھیمی گفتگو آواز کے خاموشی کی طرف جھکاؤ کے مظہر ہیں۔چنانچہ آپ دیکھیں کہ آوازوں میں جو لطف سرگوشی اور دھیمی گفتگو میں ہے وہ بلند لہجے کی آواز میں نہیں ہے۔

میرے ایک کرم فرما ''ش۔ن'' بے حد دھیمی گفتگو کے عادی ہیں، اس حد تک کہ عام لوگوں کو اُن کی آواز سننے اور سمجھنے کے لئے کان اس طرح کھڑے کرنے پڑتے ہیں جیسے وہ ہمسائے کے گھر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔لیکن میرا اور اُن کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ اور میں اکیلے ہیں اور وہ اپنے مخصوص صوفیانہ لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں۔مجھے صرف ان کے ہونٹ ہلتے نظر آتے ہیں یا کبھی کبھار ایک آدھ لفظ کانوں تک پہنچ جاتا ہے لیکن میرے نزدیک اس لفظ کی کوئی اہمیت نہیں۔میں تو اُن کی بولتی ہوئی خموش گفتگو نہ صرف پوری طرح سنتا ہوں بلکہ خود بھی ساتھ ساتھ شریکِ گفتگو رہتا ہوں۔ہمارے درمیان ابلاغ کا کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

بعض لوگ خاموشی کو شکست کی آواز سمجھتے ہیں۔ایسے لوگ تاریخ اور مستقبل سے بے خبر ''حال مست'' ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ خاموشی تو فتح کی پیش خبری ہوتی ہے۔جب

سمندر خاموش ہو یا فضا میں ہوا خاموش ہو تب خاموشی طوفان اور آندھی کی صورت اپنا جلالی روپ دکھاتی ہے۔ سقراط نے زہر پی کر، حسینؑ نے شہید ہو کر اور ابن منصور نے سولی قبول کر کے خاموشی سے صبر کے جو عظیم نمونے دکھائے بظاہر وہ اُس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست ہی تھی۔ لیکن درحقیقت ان مظلوموں اور سچوں کی خاموشی اُن کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔ مظلوموں کی خاموشی کی یہ سچائی ہمیشہ سے قائم ہے۔

خاموشی اپنے اندر معنویت کے بے پناہ امکانات رکھتی ہے جبکہ آواز کی قید میں آنے والے لفظ مخصوص اور محدود معنویت کے حصار میں آجاتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ موجودہ دور کی مار دھاڑ سے بھرپور بے معنی فلموں کے مقابلہ میں پرانے زمانے کی خاموش فلموں میں کتنی معنویت ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق جو معنی چاہے اخذ کر لے۔ ہمارے تجریدی افسانہ نگار اگر تجرید کے ہنگاموں کی بجائے خاموش اور بے لفظ کہانیوں کی طرف توجہ کریں تو انہیں پسند کرنے والے نقاد سادہ اور صاف صفحات میں اس سے بھی زیادہ معنویت ڈھونڈ نکالیں گے جتنی وہ ان کی تجریدی کہانیوں سے نکال لاتے ہیں۔

انسان خاموشی کو توڑتی ہوئی ایک چیخ کے ساتھ اس دنیا میں آتا ہے۔ نتیجۃً ساری زندگی ہنگامہ بازی میں گزار دیتا ہے۔ ہر وقت بے اطمینانی، مسئلے، پریشانی، اضطراب۔ لیکن موت کی خاموشی آتے ہی وہی پریشان حال انسان کتنا شانت اور کتنا پُرسکون ہو جاتا ہے۔

اتحاد اور امن کے نام پر قائم ہونے والے مقامی، قومی اور بین الاقوامی ہر سطح کے ادارے خاموشی کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہیں۔ اسی لئے انتشار اور بدامنی کا شکار ہیں۔ کہیں کسی اسمبلی کے ممبران میں ہاتھا پائی، کہیں ہاتھوں، ٹانگوں سے پکڑ کر باہر پھینکوانے کے منظر، کہیں گالی گلوچ۔ اگر ایسے تمام ادارے اپنے ہر اجلاس میں خاموشی کو حرزِ جاں بنا لیں تو ساری دُنیا اتحاد اور امن کا گہوارہ بن جائے۔ نہ کوئی تقریر ہو نہ تکرار، نہ کوئی قرارداد نہ بحث، اجلاس چار گھنٹے کا ہو تو بے شک آٹھ گھنٹے تک بیٹھے رہیں بلکہ سوتے رہیں۔ یوں بھاری الاؤنسز کے ساتھ اوور ٹائم بھی مل سکتا ہے۔ اس طرح خاموشی ہر سطح پر اتحاد اور امن کے ساتھ معاشی لحاظ سے بھی نعمت بن سکتی ہے۔

نئی تہذیب شور اور ہنگامے سے عبارت ہے۔ اب لڑکیاں برملا رشتے پسند یا ناپسند کرتی ہیں۔ اگلے وقتوں میں جب نئی تہذیب ابھی مسلّط نہیں ہوئی تھی، کیا حیاداری تھی۔ لڑکی کے بزرگ اور قاضی صاحب لڑکی کے پاس جاتے، اس سے دریافت کرتے، یہ رشتہ منظور ہے؟۔ پھر اس کی خاموشی کو نیم رضا ہی نہیں پوری رضامندی سمجھ کر اس کا انگوٹھا لگوا لیتے۔ یہ سب خاموشی کا فیض تھا جس سے ہمارا معاشرہ اب تقریباً محروم ہو چکا ہے۔

خاموشی خیر کی علامت ہے جبکہ شور، شر کا مظہر ہے۔ شور پسند لوگ شورش پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ فتنہ فساد کی سوجھتی ہے جبکہ خاموشی پسند کرنے والے فطرتاً امن پسند ہوتے ہیں۔ اس شوہر کی ازدواجی زندگی کبھی ناکام نہیں ہو سکتی جو مزاجاً خاموشی پسند ہو، چاہے اس کی بیوی کتنی ہی جھگڑالو کیوں نہ ہو، کیونکہ خیر کی قوت بالآخر شر کی قوت پر غالب ہی آتی ہے۔ اسی لئے تو غالبؔ نے کہا تھا:

ایک ''خاموشی'' پہ موقوف ہے گھر کی رونق

ادب میں جو لوگ ڈھول تاشوں، اخباری کالموں، تصویروں، مشاعروں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگراموں کے پُرشور بیک گراؤنڈ میوزک کے ساتھ آتے ہیں، داد و تحسین کی سطحی تالیاں سمیٹ کر جلد ہی مطلعِ ادب سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر خاموشی سے کام کرنے والے آخری دم تک کام کرتے رہتے ہیں بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی کاغذ پر چلتے ہوئے ان کے کلکِ گوہریں کی سرگوشی برابر سنائی دیتی رہتی ہے۔ گریرسن نے ہندوستان کی زبانوں پر عمر بھر کام کیا اور آخری دن تک کام کرتا رہا۔ جب اس کی ۸۰ ویں سالگرہ کے موقعہ پر لوگ اسے مبارکباد دینے کے لئے اس کے گھر گئے تو دیکھا کہ وہ خاموشی سے میز کے قریب بیٹھا تھا۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ اپنے کام میں کھویا ہوا تھا۔ جب اسے مبارکباد دی گئی تو اس نے حیران ہو کر کہا:

''ارے اسّی برس گزر گئے اور مجھے پتا ہی نہ چلا''۔

☆☆☆

نقاب

حیدرؔ بھید جہاں کے جیسے خواب کے اندر خواب
ایک نقاب اگر اُلٹیں تو آگے اور نقاب

اگلے روز ایک شاپنگ سنٹر پر خریداری کرتے ہوئے میری دو واقف خواتین سے ملاقات ہوئی تو مجھے پہلی بار ایک حیرت انگیز حقیقت سے آشنائی ہوئی۔ان میں سے ایک خاتون خاصی خوبصورت تھی اور ایک نہایت بدصورت لیکن برقع پہننے کا انداز اور آدھے نقاب کا کمال تھا کہ خوبصورت خاتون تو پہلے سے بڑھ کر خوبصورت لگ رہی تھی، بدصورت خاتون بھی حیرت انگیز طور پر خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔تب میں نے پہلی دفعہ نقاب کے بارے میں غور کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ نقاب نہ صرف حسن کو مزید نکھارتا ہے بلکہ عیوب کو ڈھانپ کر ان میں بھی ایک حسن پیدا کر دیتا ہے۔مزید غور کرنے پر مجھے انسانی ذہن اور خواتین کے نقاب کے ارتقا کی کہانیاں ایک دوسرے سے مربوط نظر آنے لگیں۔

شٹل کاک برقع اس دور کی بات ہے جب انسان خود کو اور کائناتی رموز کو جاننے کے لئے سرگرداں ہونے لگا تھا۔پھر جب ریشمیں برقع پورے نقاب کے ساتھ آیا تو گویا انسان (ایک حد تک) اپنی ذات اور کائنات کی گتّھیاں جان چکا تھا اور انہیں سلجھانے میں مشغول تھا۔ریشمیں برقع پورے نقاب سے آدھے نقاب تک آیا تو انسان بھی حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کے دور میں آ گیا۔جوں جوں خواتین کا نقاب ارتقا کے مزید مرحلے طے کرتا جائے گا انسانی ذہن بھی

اپنی اور کائناتی دریافت کے عمل میں اسی رفتار سے آگے بڑھتا جائے گا۔

ویسے دنیا میں ہر شخص نے نقاب اوڑھ رکھا ہے۔تاجر، ادیب، ملا، پنڈت، افسر، ملازم، دوکاندار، خریدار، سیاستدان۔کیا یہ سب لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں حقیقتاً ویسے ہیں؟ یہ سب لوگ محبت، خلوص، ایمان اور سچائی وغیرہ کے نقاب اوڑھ کر نفرت، ریاکاری اور جھوٹ کے کھیل کھیلتے ہیں لیکن ان کے نقابوں نے ان کے عیوب کو ڈھانپ رکھا ہے۔

انسانی چہرہ بجائے خود ایک نقاب ہے جس میں سے کبھی کبھی اس کے اندر کا حیوان جھانکتا ہوا نظر بھی آ جاتا ہے۔اندر کا فرشتہ تو اکثر چہرے پر ہی ملتا ہے۔کون ہے جو کسی دوسرے انسان کو پوری طرح جاننے کا دعویٰ کر سکے۔انسان دوسروں کے لئے تو نقاب میں ہے ہی۔خود اپنے لئے بھی وہ نقاب میں ہے۔کوئی انسان آج تک خود کو پوری طرح نہیں دیکھ سکا، نہ ہی تا حال کوئی ایسا آئینہ دریافت ہو سکا ہے جو انسان کے اندر کے سارے بھید اس پر کھول سکے۔اسی لئے تو سلطان باہوؒ نے کہا ہے:

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہُو

سطحِ سمندر کا پانی بھی دراصل ایک نقاب ہے جس نے اس کے اندر کی ایک پوری آباد دنیا کو چھپا رکھا ہے۔پھر یہ دھرتی بھی ایک نقاب ہے جس کے اندر چھپے ہوئے پُراسرار خزانے تمام تر معدنی اور آتش فشانی دریافتوں کے باوجود ابھی تک نقاب میں ہیں۔اس سے بھی آگے دیکھیں تو یہ پوری کائنات ہی ایک نقاب ہے جس کے عقب میں خالقِ کائنات کا مسکراتا ہوا، اَن دیکھا حسن ہے۔اس کائناتی نقاب سے جھانکتے ہوئے چاند، سورج، کہکشائیں اور کروڑوں بلکہ اربوں کھربوں ستارے، اسی نقاب کے عقب میں موجود ازلی حسن کی ہلکی سی جھلک دکھا کر ہمیں بے تاب کرتے رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اگر ساری کائنات بنانے کے ساتھ ایسا نقاب نہ اوڑھا ہوتا تو اس کی تلاش اور جستجو کا وہ سفر پھر کہاں ہوتا جو بڑے بڑے سادھو اور صوفی ہزاروں برسوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔گویا نقاب ہمیں سکوت اور ٹھہراؤ کی حالت سے اٹھا کر متحرک کرتا ہے۔تجسّس کی آگ ہمارے سینوں میں بھڑکا کر ہمیں سفر پر روانہ کرتا ہے اور پھر سفر بھی چوتھے

کھونٹ کا۔ چنانچہ انسان کی چاند کی طرف اور پھر اس سے بھی آگے کی طرف کا سفر ہو یا کسی عاشقِ صادق کا آدھے نقاب والے محبوب کے تعاقب میں اس کے گھر کا سفر ہو، سب اسی چوتھے کھونٹ کے سفر کی داستانیں ہیں۔

نقاب معلوم کے جہنم اور نامعلوم کی جنت کے درمیان عالمِ برزخ ہے۔ نقاب کی پُراسراریت ہمارے تجسّس کو بڑھاتی ہے۔ نقاب اوڑھنے والا خود ہی سب کو نہیں دیکھ رہا ہوتا، دوسرے بھی اس کی موجودگی کا لطیف احساس رکھتے ہیں لیکن موجودگی کے اس احساس کی لطافت اس اسرار کے ساتھ بندھی ہوتی ہے کہ وہ نقاب کے باعث دکھائی دے کر بھی دکھائی نہیں دے رہا ہوتا۔ ''ہونے'' ''نہ ہونے'' کی یہ لذّت صرف نقاب کی بدولت ممکن ہے۔ اگر ہر شے بے نقاب ہوتی تو کسی شے میں کوئی جاذبیت نہ رہتی۔ ہر شے معلوم، دیکھی بھالی، جانی پہچانی ہوتی تو ہم پر یکسانیت، بے زاری اور اُکتاہٹ طاری کر دیتی۔ لیکن یہاں تو نقاب در نقاب سلسلے ہیں۔ کسی شے یا شخصیت کا ایک نقاب ہٹائیں تو اندر سے ایک اور جہانِ حیرت ایک اور نقاب سے جھانکتا نظر آئیگا۔ پھر اس نقاب کو ہٹائیں تو ایک اور نقاب اور ایک اور جہانِ حیرت و تجسّس! اسی لئے ادب میں معلوم کی دریافت ایک احمقانہ فعل ہے یا کم از کم سطحی عمل ہے جبکہ نامعلوم کی دریافت ہی اصل تخلیقی سچائی ہے۔

انسانی جسم بھی ایک نقاب ہے جسے روح نے اوڑھ رکھا ہے۔ روح جسم سے نکل کر فنا نہیں ہوتی بلکہ موت کا نقاب اوڑھ کر اس میں زندگی بن کے دھڑکنے لگتی ہے۔ زمانے کی ماہئیت پر سنجیدگی سے غور کریں تو ماضی سے مستقبل تک زمانہ نقاب اوڑھے نظر آتا ہے۔ مستقبل کے پورے مگر باریک نقاب میں سے ہر لحظہ جھانکتا ہوا ''حال'' پلک جھپکتے ہی ماضی کے آدھے نقاب کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور ہم اس لمحے کو چھونے کی، پوری طرح دیکھنے کی خواہش دل میں ہی لئے رہ جاتے ہیں۔

ڈپلومیسی کا نقاب آج کل بہت عام ہے۔ عام زندگی سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ہر شعبۂ حیات میں اس نقاب کو بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اس کے رواج سے پُر تکلف

اخلاقیات کا فروغ ہو رہا ہے۔ بعض سر پھرے اسے منافقت قرار دیتے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔ نقصان سر پھروں کا ہی ہوتا ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی کا نقاب اوڑھ کر لوگ بڑے بگڑے کام بھی ٹھیک کرا لیتے ہیں۔ یہ ایسا خوبصورت اور دلآویز نقاب ہے جو کسی بھی طرح کے بڑے سے بڑے اور اصول پرست رہنما کو بھی مغلوب کر لیتا ہے۔

دبیز نقاب جب کسی معقول انسان کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ عاشقِ زار بن کر محلے کے شرفا کے لئے متعدد مسائل پیدا کر دیتا ہے لیکن جب یہی نقاب کسی ادیب کی عقل پر پڑتا ہے تو وہ بے سرو پا نظمیں یا مضمون نما خط قسم کی چیزیں لکھ کر اپنے آپ میں ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ شاید نفسیاتی مسئلہ!



وِگ

یہ بال و پر تو چلو آ گئے نئے حیدرؔ
بلا سے پہلے سے وہ خال اور خد نہ رہے

جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے ہی دیکھا کہ اباجی کے سر پر بال نہیں تھے۔ بچپن سے ہی میری شدید خواہش رہی کہ اباجی کے سر پر بال سجے ہوئے دیکھوں۔ اس کی دو ممکنہ صورتیں تھیں یا تو کوئی ایسی دوا مل جائے جس سے بال دوبارہ اُگ آئیں یا پھر وِگ سجالی جائے۔ تب وگ خریدنے کے وسائل میسّر نہیں تھے پھر بھی میں نے ایک بار اباجی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔ اور بس!۔ وسائل میسّر آنے سے پہلے اباجی فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی یہ انوکھا سا واقعہ رونما ہوا کہ دنیائے فانی سے کوچ کرنے کے بعد اباجی میرے اندر آن بسے۔ دل میں، لہو میں، روم روم میں بس گئے یہاں تک کہ میرے سر پر بھی پوری طرح نمودار ہو گئے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا ایک حصہ ہے۔ اباجی کی محبت نے جب میرے اندر اور باہر پر پوری طرح غلبہ کر کے مجھے تصوف کے مقام فنائیت تک پہنچا دیا تب میں، میں نہ رہا۔ میں نے آئینہ دیکھا تو ایسے لگا جیسے بیس برس پہلے کے اباجی کو دیکھ رہا ہوں۔ سر سے پاؤں تک وہی صورت۔ پھر میں نے مقام فنا سے مقام بقا کا رُخ اختیار کرنے کا سوچا۔ دراصل اب ہمہ وقت اباجی سے ہی ملاقات ہوتی رہتی تھی اور اپنے آپ سے ملنے کی صورت ہی نہیں بن رہی تھی۔ تب اپنے آپ سے ملنے کی خواہش نے جوش دکھایا:

چلو اپنی بھی جانب اب چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سُونا پڑا ہے

سو میں نے ایک مناسب سی وگ خریدی۔ اپنے مخصوص (مگر گمشدہ) ہیر اسٹائل کے مطابق اسے برش کر کے سر پر سجالیا۔ وگ کا سر پر سجانا تھا کہ میکدے سے میری جوانی خود ہی اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اپنی جانب کا ویران راستہ رونقوں سے بھر گیا۔ زندگی کا میلہ سا لگ گیا مجھے احساس ہوا کہ میں بیالیس برس کی عمر میں بلاوجہ باون برس کا بنا ہوا تھا۔ وگ کے بغیر میں اپنی عمر سے کہیں آگے نکل گیا تھا۔ وگ نے مجھے میری اصل عمر عطا کر دی۔ وگ پہن کے پہلے پہل آئینہ دیکھا تو ایسے لگا کہ کسی ایسے اجنبی مہمان سے مل رہا ہوں جس نے میرے گھر میں آ کر میرا ہی لباس زیب تن کر رکھا ہے لیکن ''خود کو پہچان'' والا فرمان یاد آیا تو اپنی معرفت کے مرحلے طے ہونے لگے۔ اپنے آپ سے ملاقات ہونے لگی۔

کسی سیلاب یا طوفان کے آنے کے بعد جب کوئی ہنستا بستا شہر ویران اور برباد ہو جاتا ہے تب باہمت اور جرأت مند لوگ اسے از سرِ نو آباد کر کے پہلے سے بھی خوبصورت بنا دیتے ہیں جبکہ کاہل اور نکمّے لوگ عرصہ دراز تک خیمے بنا کر گزارا کرتے ہیں۔ اسی طرح وقت کا بے رحم طوفان کئی انسانی سروں پر تباہی پھیلا کر ان کی اصل صورت کو بگاڑ دیتا ہے۔ وِگ نہ صرف اسی تباہی کا تدارک کرتی ہے بلکہ انسان کو اس کی اصلی صورت بھی عطا کر دیتی ہے۔ وِگ پہننے والے لوگ وہ باہمت اور جرأت مند لوگ ہیں جو وقت کی پھیلائی ہوئی تباہی سے پھر نئی تعمیر کرتے ہیں جبکہ ٹوپی پہن کر گزارہ کرنے والے لوگ خیموں میں پناہ لینے والوں جیسے ہیں۔

سیاہ رات اس دنیائے موجود کے سر پر ''زُلف دراز'' والی وگ ہے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اس زُلف پر گرے ہوئے شبنمی موتی ہیں، کہکشاں اس کی مانگ میں بھری ہوئی افشاں ہے اور چاند ایک خوبصورت سنہری کلپ۔ یہ دنیائے موجود، رات بھر کسی محبوبۂ دلنواز کی طرح اپنی زلفوں کی مہک بکھیرتی ہے لیکن دن ہوتے ہی سورج کی تپش سے گھبرا کر اس وگ کو اُتار کر رکھ دیتی ہے۔ وگ میں یہ سہولت ہے کہ آپ جب چاہیں وگ پہن کر اپنی اصل صورت دیکھ

لیں اور جب چاہیں وگ کو اتار کر قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ کر لیں۔

ہرے بھرے کھیت، باغات اور جنگلات بہار کے موسم میں خوبصورت وگیں پہن کر اپنی اصل صورت دکھاتے ہیں لیکن خزاں کسی حاسد کی طرح اُن وگوں پر طنز کرتے ہوئے آتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے ان سب کی وگیں اتارتی اور اُدھیڑتی چلی جاتی ہے۔ پھر ایک شیطانی قہقہہ لگا کر کہتی ہے: یہ باغات، جنگلات اور کھیت سب جھوٹ تھے۔ ان سب نے بھیس بدل کر انسانوں کو دھوکہ دیا تھا انہیں بہار کا غلام بنانے کی سازش کی تھی۔ اب اُن کا اصلی روپ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ تمام انسان اُن کا اصلی روپ دیکھ لیں اور بار بار جان لیں کہ یہ بہار ایک دھوکہ ہے۔ زندگی کی حقیقت فنا ہے۔خزاں اسی سچائی کو پھیلانے کے لئے قدرت کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ وقتی طور پر خزاں کی نحوست اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اسی دوران بہار پھر اپنے کھوئے ہوئے وقت کو واپس لانے کے لئے اندر ہی اندر کام کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی خزاں کی نحوست زائل ہونے لگتی ہے بہار پھر سارے کھیتوں، باغات اور جنگلات کے سروں پر ہریالی کی نئی وگیں سجا دیتی ہے۔ پھولوں کا مسکرانا، پرندوں کا چہچہانا، تتلیوں کا آنا بھنوروں کا منڈلانا۔ زندگی کا میلہ پھر سے لگ جاتا ہے۔

خزاں کے ہمنوا بعض دل جلے بھی وگ پہننے کو بھیس بدلنے یا بہروپ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن وگ پر بہروپ کا الزام بہتان ہے۔ یہ تو ایک ایسی سیدھی سادی سچائی ہے جو انسان کو اس کے اصل روپ میں پیش کرتی ہے۔ کوئی اس سچائی کو مانے نہ مانے یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس کے برعکس بہروپ تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر کے شیطان کو مہارت کے ساتھ چھپا کر باہر فرشتہ بنا پھرے۔ مایا لگی ہوئی پگڑی کا اکڑا ہوا طرّہ، تکبر کی ماری اکڑی ہوئی گردن، ریاکاری، کی لمبی داڑھی اور نفیس جبّہ۔ یہ جبّہ و دستار بہروپ ہے۔ ایسے بہروپیوں کا یہ ساز وسامان اُتار لیا جائے تو نیچے سے ن۔م۔راشد کا لا=انسان برآمد ہوگا۔ جبّہ و دستار کا بہروپ تو خلقِ خدا کو گمراہ کرنے اور غلام بنانے کا ڈھونگ ہے جبکہ اس کے برعکس وِگ اس فکری آزادی کا اعلامیہ ہے جو غلامی سے نجات دلائے۔

وہ لیڈر بہروپیے ہیں جو عوام کی فلاح کے دعوے کرتے ہیں اور عملاً عوام کا استحصال

کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی بہروپیے ہیں جو مغربی ممالک میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے من گھڑت اور جھوٹے بیانات دیتے ہیں کہ گوئبلز کی روح بھی شرما جائے اور اپنے تمام جھوٹے بیانات کے باوجود سچائی کے علمبردار ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ادب میں بھی ایسے کئی بہروپیے پائے جاتے ہیں۔ کسی مالدار ادیب سے دو لاکھ روپے کھا کر اسے ۲۵ ہزار روپے کا انعام دلانے والے، مناسب حق الخدمت کے طور پر کسی لولے لنگڑے افسانے کو دورِ حاضر کا ممتاز ترین افسانہ قرار دینے والے، کمپیوٹر کے عہد کی مناسبت سے کمپیوٹر کی قیمت پر مدح سرائی کرنے والے، ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر غریب مزدوروں اور کسانوں کی حمایت میں ادب لکھنے والے، اصل بہروپیے تو اس قماش کے لوگ ہیں جبکہ وِگ کیرلین پراسیس کے بیان کردہ گم شدہ حصے کی دریافت میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ وِگ کا جہان بہروپیوں سے یکسر مختلف ہے۔ وِگ پر بہروپ کا الزام عائد کرنے والے حقیقتاً خود بہروپیے ہیں جو اپنے بہروپ کا بھرم قائم رکھنے کے لئے وِگ کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وِگ پہننا اپنے گم شدہ حصے کی بازیافت کا عمل ہے جس کے بغیر اپنی پہچان اور اپنے عرفان کے مرحلے طے نہیں ہو سکتے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد میں نے ایک بار پھر آئینے میں خود کو دیکھا تو مجھے ایسے لگا کہ اباجی میرے سامنے کھڑے ہیں۔ اُن کے سر پر گھنے اور خوبصورت بال سجے ہوئے ہیں جنہیں سلیقے سے سیٹ کیا گیا ہے۔ اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میری بچپن کی وہ آرزو پوری ہوگئی ہے کہ کبھی اباجی کے سر پر بھی بال سجے ہوئے دیکھ سکوں۔ تب ہی مجھ پر منکشف ہوا کہ اباجی میرے اندر کی طرح باہر بھی اسی طرح موجود ہیں جیسے وِگ سے پہلے موجود تھے، اس فرق کے ساتھ کہ میں ان کی عمر کا جو زمانہ نہیں دیکھ سکا تھا اب مجھے وہ زمانہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ میں آئینے میں اباجی کو دیکھ کر مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

انکشافِ ذات کا یہ نظارہ وِگ سے سرافراز ہوئے بغیر کہاں ممکن تھا!

☆☆☆

فاصلے،قربتیں

جب سرکار کی جانب سے منظوری ہوتی ہے
فاصلہ کتنا بھی ہو عین حضوری ہوتی ہے

مجھے سرسبز و شاداب پہاڑ ہمیشہ اچھے لگتے رہے ہیں۔اُن کی بلند قامتی،شادابی اور ہریالی سے مجھے انوکھی سی روحانی آسودگی کا احساس ہوتا رہا اور میں من ہی من میں ان کی عظمت کا معترف رہا۔لیکن جب ایک بار مجھے ایسے ہی ایک پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا شوق چرایا اور میں اس سفر پر روانہ ہوا تو میرے پہلے تصوّر کو شدید ٹھیس پہنچی۔میں نے دیکھا کہ دور سے اتنا عظیم دکھائی دینے والا پہاڑ ایسے خوفناک ٹیڑھے میڑھے رستوں اور ہولناک کھائیوں سے بھرا ہوا تھا جو سیدھا موت کے منہ میں لے جانے والی تھیں۔اس کا دامن خونخوار جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے نیچے دیکھا تو اچھے بھلے انسان،بڑی بڑی عمارتیں،گاڑیاں وغیرہ مجھے بہت ہی معمولی اور چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی طرح دکھائی دیئے۔بے معنی اور حقیر۔!تب مجھے فاصلے کا کمال معلوم ہوا جس نے پہاڑ کے اندر کے ولن کو چھپا کر اسے ہیرو کے روپ میں پیش کر رکھا تھا۔تب ہی مجھے اندازہ ہوا کہ بڑے بڑے عظیم لوگ،پہاڑ جیسے عظیم لوگ۔اکثر محض اس لئے عظیم لگتے ہیں کیونکہ ہم انہیں فاصلے سے دیکھتے ہیں۔اپنی نام نہاد عظمت کی بلندی سے انہیں اچھے بھلے انسان اور بڑی بڑی چیزیں بھی حقیر سی دکھائی دیتی ہیں۔فاصلے اور بلندی کے اس تماشے کی حقیقت کو سمجھنے کی بجائے ایسے ’’عظیم لوگ‘‘ سچ مچ اپنی عظمت کے خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔چنانچہ جو لوگ

انہیں قریب سے دیکھ لیتے ہیں اُن پر اُن کی عظمت سے زیادہ اُن کی شخصیت کے مخفی جوہر کھل جاتے ہیں اس لئے وہ ان کی عظمت کے منکر ہو جاتے ہیں۔ایسے منکرین کے ساتھ پھر کیا سلوک کیا جاتا ہے یہ ایک الگ داستان ہے بلکہ داستانوں کا ایک سلسلہ ہے جس سے تاریخِ انسانیت بھری پڑی ہے۔

طویل فاصلے سے سورج جیسے چمکتے ہوئے لوگ،اپنے اندر سورج سے بھی زیادہ بڑا جہنم آباد کئے بیٹھے ہوتے ہیں یہ الگ بات کہ فاصلے پر بٹھائے ہوئے لوگوں کے لئے جنت کی بشارتیں نشر کرتے رہتے ہیں۔اگر کوئی ایسی بشارتوں پر شک کرنے لگے تو اس کی زندگی کو ہی جہنم بنا دیا جاتا ہے۔فاصلے اور قربت کی کرشمہ سازی کے انکشاف کے بعد مجھے فاصلے اور قربت کے کئی رنگ اور کئی روپ دکھائی دینے لگے۔

قربت کی انتہا یکتائی ہے جبکہ فاصلے کی ابتدا سے فرقِ من و تو پیدا ہوتا ہے۔قربت محبت اور عقیدت کا ثمر ہے اس لئے دل کے زیرِ اثر ہے۔عقل و شعور سے اس کا معاملہ بس واجبی سا ہوتا ہے۔فرقِ من و تو،شعور و آگہی کا پہلا سبق ہے(باقی کے سارے سبق اسی فرق کی تشریح اور تفسیر ہیں)اس لئے فاصلے کو عقل و شعور کے زیرِ اثر سمجھا جا سکتا ہے۔اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قربت آتشِ نمرود یا آتشِ محبت میں بے خطر کود پڑنے کا نام ہے جبکہ فاصلہ ہمیشہ محوِ تماشائے لبِ بام رہتا ہے بلکہ بعض اوقات لبِ بام سے بھی پرے کھڑا ہوتا ہے۔اگر فاصلہ بھی اس آتش میں کود پڑے تو پھر فرقِ من و تو ختم ہو جائے گا،فاصلہ ختم ہو جائے گا بس قربت ہوگی،یکتائی کا عالم ہوگا۔اسے نیستی یا فنا بھی کہہ سکتے ہیں۔

تخلیق کے امکانات کو قربت یکجا کرتی ہے اور فاصلہ تخلیقات کے انبار لگاتا چلا جاتا ہے۔موجودہ کائنات کی تخلیق کا جو سائنسی نظریہ مقبول ہے۔اس کے مطابق پہلے سارا کائناتی مادہ یک جا تھا گویا قربت کی انتہا تھی۔یہ مادہ ایک بہت بڑے گولے کی صورت میں تھا جس کے اندر تخلیق کے سارے امکانات موجود تھے۔بڑے دھماکے (BIG BANG) کے نتیجہ میں جب یہ گولا پھٹا تو فاصلہ پیدا ہونے لگا۔فرقِ من و تو پیدا ہونے لگا۔یہ کہکشاں ہے،یہ سورج ہے،یہ سیارے

ہیں،انہیں سیاروں میں یہ زمین ہے اور یہ ہماری زمین کا چاند ہے۔قربت نے ان ساری رونقوں کو اپنے اندر سمیٹ رکھا تھا فاصلے نے انہیں محبت کے زخموں کی نمائش کی طرح باہر لا کر سجا دیا۔فاصلہ اور قربت ایک دوسرے کے لئے اسی طرح لازم وملزوم ہیں جس طرح ایٹم کا ہر اینٹی پارٹیکل اور پارٹیکل۔رات اور دِن۔اہرمن اور یزداں۔اور میری بیوی اور میں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔(میری بیوی اور میرے معاملے میں آپ لازم وملزوم کی بجائے ''لازم وملزم'' سمجھیں۔الزامات کی نوعیت وہی ہے جو یورپ میں ہر شریف شوہر کو اپنی بیوی سے سننا پڑتے ہیں)

آنکھیں ایک خاص حد تک کی قربت اور ایک خاص حد تک کے فاصلے سے ہی دیکھ سکتی ہیں۔قدِ آدم آئینے سے بالکل قریب ہو کر کوئی اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔خود کو دیکھنے کے لئے بھی تھوڑا سا فاصلہ ضروری ہے۔تمام فاصلوں کو مٹاتے ہوئے دو جوان دلوں کو شاید اسی لئے اپنے ارد گرد کچھ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ وہ قربت کی انتہا تک پہنچ رہے ہوتے ہیں۔''یہ رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی'' کا ایمان افروز منظر ہوتا ہے۔یار لوگ مشرقی ممالک میں تو اُسی وقت کیدو کا روپ دھار کر اصلاح معاشرہ کا فریضہ ادا کرنے لگ جاتے ہیں جبکہ مغربی ممالک میں انہیں نا قابلِ اصلاح سمجھ کر ''گونگے گواہ'' کی طرح آگے بڑھ جاتے ہیں۔

فاصلے کے معاملے میں جیومیٹری کے کئی زاویے بھی آڑے آتے ہیں۔میدانی یا صحرائی علاقے میں آپ ایک خاص حد تک صاف اور پھر مدھم مدھم دیکھ سکتے ہیں۔بڑے شہروں میں بیس پچیس منزلہ عمارتوں سے دیکھیں تو ارد گرد کا منظر کسی اور ہی روپ میں سامنے آتا ہے۔پہاڑی علاقے میں بل کھاتے ہوئے،مڑتے ہوئے اونچے نیچے رستے تو قدم قدم پر چونکاتے ہیں۔۴۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا آدمی جس منظر کو صاف طور پر دیکھ رہا ہوتا ہے۔۲۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا آدمی محض قریبی موڑ آڑے آنے کی وجہ سے اس منظر کو نہیں دیکھ سکتا۔کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے جیسے سارے نظریات ایسے ہی بل کھاتے ہوئے رستوں کی کرشمہ سازیاں ہیں۔۲۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا جس منظر کا انکار کر رہا ہے بظاہر اس کا انکار درست ہے اور ۴۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا جس منظر کی موجودگی پر اصرار کر رہا ہے اس کا اصرار بھی سچ ہے۔مسئلہ تو صرف اتنا

ہے کہ دونوں فریق یہ نہیں کرتے کہ اپنی اپنی جگہ پر جم کر دوسرے کو جھوٹا قرار دینے کی بجائے خود دوسرے کی جگہ پر جا کر بھی اُس منظر پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں۔اگر ایسا ہو جائے تو نظریاتی سطح پر صرف اپنے گروہ کو سچا اور دوسرے گروہوں کو جھوٹا قرار دینے کا منفی رویہ ختم ہو جائے۔

قربت کا ایک رنگ مرد اور عورت کے تعلق سے عبارت ہے۔اس قربت کے مختلف مراحل ہیں۔آخری مرحلے کے اختتام پر فاصلہ وجود میں آجاتا ہے:

بے دم ہوں میں اِدھر تو اُدھر وہ نڈھال ہے

گویا قربت کی انتہا سے فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح فاصلے کی انتہا قربت کو جنم دیتی ہے۔یہ کوئی فلسفہ نہیں حقیقت ہے۔اپنی زمین کا نقشہ دیکھ لیں جو علاقے ایک دوسرے کی مخالف سمت،زمین کی آخری انتہاؤں پر واقع ہیں اس حقیقی گلوب میں سب سے زیادہ قریب ہیں۔بیوی جسمانی طور پر قریب ہوتی ہے لیکن اس کی قربت میں ایک فاصلے کا احساس رہتا ہے۔جبکہ محبوبہ کتنے ہی جغرافیائی فاصلے پر کیوں نہ ہو اس کے فاصلے میں بھی قربت کی مہک تازہ رہتی ہے۔فاصلے میں قربت اور قربت میں فاصلہ۔فاصلے کی انتہا میں قربت اور قربت کی انتہا میں فاصلہ۔

کہیں قربت اور فاصلہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ تو نہیں؟

☆☆☆

بڑھاپے کی حمایت میں

یہ ڈھلتی عمر بھی شعلے مرے بجھا نہ سکی
لہو میں اپنے ابھی اشتعال باقی ہے

پچھلے دنوں مجھ سے بمشکل پانچ سات سال کم عمر کے ایک نوجوان نے مجھے ایک محفل میں انکل کہہ کر مخاطب کیا تو فوری طور پر مجھے اس پر شدید تاؤ آیا۔ کیونکہ عمروں میں پانچ سات برس کا فرق چچا بھتیجے کے مقابلے میں بڑے اور چھوٹے بھائی کا فرق کہلا سکتا ہے۔لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ مجھے مخاطب کرنے والے نے مجھے جس نام سے بھی مخاطب کیا ہے اس میں اس کا خلوص شامل ہے اور مجھے اس کے خلوص کا احترام کرنا چاہئے۔اس نوجوان کے خلوص کے احترام کے باوجود یہ وسوسہ میرے ذہن میں گھر کرنے لگا کہ شاید میری جوانی مجھ سے دامن چھڑاتی جارہی ہے اور بڑھاپے نے دبے پاؤں میری طرف آنا شروع کر دیا ہے۔ میں اسی وسوسے میں گھرا ہوا تھا جب گیان کا ایک حیرت فزا لمحہ مجھ پر اُترا۔۔میں نے زندگی کے تینوں زمانوں۔بچپن، جوانی اور بڑھاپے کو اس گیان کی روشنی میں دیکھا تو بڑھاپا مجھے سب سے اعلیٰ، ارفع اور برتر نظر آنے لگا۔

بچپن انسان کے گزرے ہوئے ماضی بعید کی طرح اپنے خاندان سے چمٹے رہنے میں عافیت محسوس کرنے کا عہد ہے۔ ماضی کا ابتدائی انسان بھی اسی طرح زمین سے پیوست اور اپنے معاشرے سے چمٹا ہوتا تھا۔ جوانی حال مست رہنے کا عہد ہے جس طرح ہم اپنے حال میں

رہ کر اپنے حال سے بے خبر ہوتے ہیں۔ایسے ہی جوانی میں بھی اپنے آپ سے بے خبری کا عجیب عالم ہوتا ہے۔لیکن بڑھاپا مستقبل کی طرح یقین اور بے یقینی کی دھند میں لپٹا ہوا عالم برزخ ہے۔ یہاں سے آگے انسان کے ماورائے زمان ومکان ہونے کا سفر شروع ہوتا ہے۔ بڑھاپے کے عالمِ برزخ میں انسان ماورائے مکان ہونے کے لئے اپنے سارے مکان کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے کمرے میں سمٹ آتا ہے(یا سمیٹ دیا جاتا ہے)۔پھر یہاں آ کر اس کے نزدیک سارا زمانہ ہی بے وقعت ہوجاتا ہے کیونکہ بوڑھے آدمی کو اس سے کوئی غرض ہی نہیں ہوتی کہ ناشتہ دوپہر کو دیا گیا اور دوپہر کا کھانا شام کو ملا اور شام کا کھانا ملا ہی نہیں۔ بڑھاپا اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ زمان ومکان کی رہی سہی برائے نام حدود کو توڑ کر ایک طرف تو پوری طرح ماورائے زمان ومکان ہوجاتا ہے اور دوسری طرف زمان کے رگ وپے میں سرایت کر کے مکان پر قابض رہتا ہے۔اس کی اولاد، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں، ماضی، حال اور مستقبل کے روپ دھارے اس کے نہ ہونے کے باوجود اس کے ہونے کی گواہی بنے رہتے ہیں۔

بچپن میں ہم جوانوں کو دیکھ کر جوان ہونے کی تمنا کرتے ہیں لیکن جوان ہوتے ہی بچپن کو یاد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔اس کے برعکس جوانی میں ہم آنے والے بڑھاپے کے تصوّر سے ہی خوف کھاتے ہیں۔لیکن بڑھاپا آتے ہی ہم پر فکر ودانش کے ایسے انوار برستے ہیں کہ نہ صرف بڑھاپے سے سارا خوف دور ہوجاتا ہے بلکہ ہماری زندگی میں ہی بڑھاپا ہمیں بچپن اور جوانی ہمارے بیٹوں اور پوتوں کی صورت میں دکھا دیتا ہے۔بعض لوگ اپنے بڑھاپے میں اپنی جوانی کو اپنے بیٹے کے روپ میں دیکھنے کی بجائے خود جوان بننے کی کوشش کرتے ہیں۔اس نیک مقصد میں کامیابی کے لئے مخصوص قسم کے حکیموں اور ڈاکٹروں کی چوکھٹوں پر حاضری دیتے ہیں۔ ایسے بوڑھوں کے بڑھاپے کے بارے میں غالبؔ نے کہا تھا:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

بچپن معصومیت سے عبارت ہے۔ جوانی حیرت وتجسس سے، جبکہ بڑھاپا فکر ودانش کے انوار کے ساتھ معصومیت اور حیرت وتجسّس کو بھی اپنے جلو میں لیے ہوتا ہے۔حضرت موسیٰ

علیہ السلام کی مثال لیجئے کہ مقامِ نبوّت سے سرفراز کئے جانے کے باوجود کس معصومیت کے ساتھ اللہ میاں سے بالمشافہ ملاقات کے متمنّی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بار بار سمجھاتے رہے اور فرماتے رہے ''لن ترانی''۔لیکن یہی ارشاد ان کے تجسّس کو بڑھاتا ہے اور پھر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ پھر معصومیت اور حیرت وتجسّس کا یہ امتزاج اُن کی فکر و دانش میں ایک انوکھی روحانی لذت بھر دیتا ہے۔ بڑھاپے اور فکر و دانش کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیغمبری چالیس سال کی عمر میں عطا ہوئی۔فی زمانہ متعدد ممالک کے constitutions میں سربراہِ مملکت کے لئے عمر کی کم از کم حد چالیس سال رکھی گئی ہے۔۔۔۔جبکہ چالیسواں سال بڑھاپے کا نقطۂ آغاز ہے۔

بڑھاپا بزرگی اور متانت عطا کرنے کے ساتھ زندگی کے تجربات کا نچوڑ نکال کر ایک رہنما کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ بڑھاپے میں گرگِ ظالم بھی پرہیزگار بن جاتا ہے اور یہ پرہیزگاری اسے قویٰ کے اضمحلال اور زندگی کے تجربات کے نچوڑ کے بعد نصیب ہوتی ہے۔(آفرین ہے ان بزرگوں پر جو ستر سال کی عمر کے بعد بھی جوان لڑکیوں سے شادی کرنے کی جرأت رکھتے ہیں اور یوں سرِ عام گرگ ظالم کی پرہیزگاری کو بھی شرمسار کر دیتے ہیں۔خواہ ایسے جرأت مندانہ اقدام کے نتیجہ میں جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑیں۔)

بچپن ایسا زمانہ ہے جس میں غیر محسوس طریقے سے بخارات اٹھتے رہتے ہیں۔جوانی میں یہ بخارات گہرے بادلوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ایسے بادل جن میں گرج بھی ہوتی ہے اور چمک بھی۔ پھر یہ موسلا دھار بارش بن جاتے ہیں۔ بڑھاپا بارش کے بعد قوسِ قزح کا منظر پیش کرتا ہے۔زندگی کے تجربوں کی دھوپ سے ہفت رنگ عکس اُبھرتا ہے اور ایک حسین منظر بن جاتا ہے۔ گرد وغبار دُھل جاتا ہے۔ چاروں طرف تازگی اور ہریالی کا سماں ہوتا ہے۔ہلکی ہلکی اور ٹھنڈی میٹھی ہوا انسان کو وہ آرام وسکون بخشتی ہے جو بخارات اٹھنے کے عمل یا موسلا دھار بارش کے دوران ہرگز نصیب نہیں ہوسکتا۔

انسانی بڑھاپے میں مرد اور عورت کی تفریق فطری طور پر قائم رہتی ہے۔ بڑھاپے

کے باعث بوڑھی عورت کا سر ہمیشہ اثباتی انداز میں ہلنے لگتا ہے اور بوڑھے مرد کو اپنی زلیخا سے یہ پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آتی کہ اس کا سر کیوں ہل رہا ہے کیونکہ جواباً اس کا اپنا سر منفی انداز میں ہلنا شروع ہو چکا ہوتا ہے۔

انسان بچپن میں ضدی ہوتا ہے اور جوانی میں باغی۔لیکن بڑھاپے میں ضد اور بغاوت دونوں سے دامن چھڑا کر خود سپردگی اور راضی بہ رضا کے صوفیانہ مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔اولاد جتنی گستاخ، بے ادب اور بے پرواہ ہوگی انسان اس صوفیانہ مقام میں اتنا ہی ترقی کرتا جائے گا اور آخر کار اس مقام لاہوت تک جا پہنچے گا جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔اس مقام پر پہنچ کر وہ اپنی اولاد کو بھی خود سے متعلق ہر جھنجھٹ سے آزاد کر دیتا ہے اور خود بھی آسودگی کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے۔

مغرب میں چونکہ کمپیوٹرازم فروغ پا رہا ہے اس لئے انہوں نے مقام لاہوت تک جلدی پہنچنے کے لئے ''بوڑھوں کے لئے خودکشی کے آسان طریقے'' اور ''....آرام دہ طریقے'' قسم کی کتابیں چھاپ کر بوڑھوں کے لئے بہت سی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔

بڑھاپے کی ان فضیلتوں اور فیوض کے منکشف ہونے کے بعد میں نے جب اپنی عمر پر دوبارہ غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں تو ایک برتر مقام پر فائز ہونے والا ہوں۔اس احساس کے ساتھ جب میں نے سوچا کہ چالیسویں برس تک پہنچنے کے لئے ابھی سات برس مزید انتظار کرنا ہے تو مجھے یہ سات برس اب پہاڑ کی طرح محسوس ہونے لگے ہیں۔



اطاعت گزاری

آخر لکیر اپنے فقیروں کو کھا گئی
بس اک فقیر بچ گیا ہٹ کر لکیر سے

میرے ایک جوشیلے لیکن کم فہم دوست کا خیال ہے کہ اطاعت کا مادہ افراد اور قوموں کو فکری لحاظ سے بانجھ اور اپاہج بنا دیتا ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ غلامی کی قدیم روایت نے آج کے مہذب دور میں اطاعت گزاری کی مہذّب صورت اختیار کر لی ہے۔ اطاعت گزاری کو ایک اعلیٰ خوبی کے طور پر پیش کر کے افراد اور قوموں کو اس کے جال میں پھنسا کر غلام بنایا جاتا ہے۔ میں نے اس وقت تو دوست کی بات میں بڑا وزن محسوس کیا لیکن بعد میں جب غور کیا تو مجھ پر لمحہ بہ لمحہ اطاعت گزاری کی برکات منکشف ہوتی گئیں۔

عام حالات میں اطاعت گزاری کا مادہ ہزار نعمت کے برابر ہے جبکہ تنگ دستی کی حالت میں تو لاکھ نعمت سے بھی بڑھ کر ہے۔ سچے اطاعت گزار اپنے آقا یا ممدوح کی بات کبھی رد نہیں کرتے خواہ ظاہراً وہ بات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ ظاہر بین نہیں بلکہ باطن بین ہوتے ہیں۔ اپنے اندر کی تیز فراست کے باعث انہیں یہ بھید معلوم ہو چکا ہوتا ہے کہ وہ کسی سورج یا چاند کے نہیں، اپنے آقا کے اطاعت گزار ہیں۔

اطاعت گزاری، فرماں برداری اور وفا شعاری ایک ہی حقیقت کے مختلف چہرے ہیں

۔ اطاعت کا مادہ انسانی نفس کو سنگسار کر کے اس کی روح اور ذہن کو ہر طرح سے سبکسار کر دیتا ہے، گویا اطاعت سے مراحلِ تصوّف کا آغاز ہوتا ہے اور کمال اطاعت تک وہ کامل صوفی بن جاتا ہے۔ دنیا کی لعنت ملامت یا اپنے ضمیر کی طعنہ زنی اسے اطاعت سے نہیں روک سکتی۔ کوئی عاشق اس وقت تک سچا اور کامیاب عاشق نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی وفا کے جوہر کو محبوب کی کامل اطاعت کے مقام تک نہ پہنچا دے۔ اسی لئے سچا عاشق اطاعت کی ایک ہی جست سے عشق کے سارے مرحلے طے کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔

تجریدی تصویر کی طرح اطاعت گزاری بھی تہ در تہ نتائج (معانی) کی حامل ہے۔

آپ نے بڑے افسر کی اطاعت کی تو اس کے منظورِ نظر بن گئے۔ بڑے افسر کے منظورِ نظر بنتے ہی ماتحت عملہ کے اطاعت گزاروں کی ایک فوج آپ کے زیرِ نگیں آ گئی۔ گویا افسروں کی اطاعت کرنے والوں کو بھی ایک افسری نصیب ہو جاتی ہے۔ آمروں کی اطاعت کرنے والوں کو اسی طرح ایک قسم کی آمریت مل جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک مسلسل جاری و ساری رہتا ہے۔ اطاعت گزاری ایک طرف حاکمِ اعلیٰ کے دل میں اطاعت گزار کے لئے محبت اور ہمدردی کے ساتھ نرم گوشہ پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف اس اطاعت گزار کی اطاعت پر کمر بستہ ہو جانے والے ماتحتوں کے دل میں بھی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ یوں اطاعت گزاری کے نتیجے میں دنیا امن اور محبت کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ تمام جماعتیں جو دُنیا کو امن اور محبت کا گہوارہ بنانے پر تُلی ہوئی ہیں، سب سے زیادہ زور اپنی تنظیم کی اطاعت پر ہی دیتی ہیں۔ سچے اور کامل اطاعت گزار ایسی جماعتوں کے لئے روح کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب بھی کوئی فرد یا چھوٹا سا گروہ ایسی کسی جماعت سے انحراف کرنے لگتا ہے تو جماعت کے سب چھوٹے بڑے اسے کچا چبا ڈالنے پر تُل جاتے ہیں اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک اسے تہ تیغ نہیں کر دیتے یا پھر سے اطاعت پر مجبور نہیں کر دیتے۔ ایسے نازک موقع پر اخلاقیات کے سارے اصول بالائے طاق بھی رکھ دیئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اغماض و درگزر کا تو خیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انحراف کرنے والوں کا مسئلہ پوری جماعت کی بقاء کا مسئلہ

ہوتا ہے۔منحرف ہونے والوں کا محاسبہ اور کردار کشی نہ کی جائے تو باقی اطاعت گزاروں کو اطاعت گُشی کے عمل سے کون روک سکتا ہے!

ہمارے معاشرے میں گھریلو ناچاقیوں کے باعث کئی گھروں میں طلاقیں ہوجاتی ہیں اور کئی گھر مستقل طور پر میدانِ کارزار بنے رہتے ہیں۔ایسے گھر دراصل اطاعت کی نعمت سے محرومی کے باعث جہنم کا نقشہ بنتے ہیں۔ساس، بہو میں سے کوئی ایک اور میاں بیوی میں سے اگر دونوں ہی اطاعت گزاری اختیار کرلیں یعنی اپنی آنکھیں، کان اور ہونٹ پوری طرح مقفّل کرلیں تو نہ صرف ازدواجی زندگی خوشگوار اور مثالی ہوجائے گی بلکہ سارا گھر جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

کامل اطاعت کے وصف سے محروم لوگوں کو بھیڑوں، بکریوں کے گلّوں سے سبق سیکھنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اشرف المخلوقات کا لقب تو بھیڑ بکریوں کو ملنا چاہئے جن کے ہاں سرِ تسلیم خم کرنے بلکہ قلم کرانے کا وصف پیدائشی ہوتا ہے۔

سچے اطاعت گزار کا کمال یہ ہے کہ جو سانحہ اس کے اپنے گروہ کے ساتھ گزرے اسے تو وہ خدا کی طرف سے آزمائش اور امتحان قرار دیتا ہے لیکن اگر ویسا ہی سانحہ بلکہ اس سے بھی کم تر سانحہ کسی دوسرے گروہ کو پیش آئے تو پورے ایمانی جوش وخروش کے ساتھ اسے عذابِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے۔کیسا صحیح رویّہ ہے!

ایں سعادت بزورِ بازو است

اچھا اطاعت گزار اول تو اپنے کھونٹے سے بندھے رہنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے تاہم اگر گھومنا پھرنا چاہے تو شاہی فرمان کے مطابق تین کھونٹ کے علاقوں تک ہی سفر کرتا ہے، چوتھے کھونٹ کی طرف کبھی نہیں جاتا۔ نتیجۃً آگہی کی ان ساری اذیتوں اور عذابوں سے محفوظ رہتا ہے جو ہر اُس شخص کا مقدر ہوتے ہیں جو چوتھی کھونٹ کی طرف نکل جاتا ہے۔ہمارے ہاں ادب میں بھی اطاعت گزاری کے باقاعدہ سلسلے جاری ہیں۔نظریاتی اطاعت گزاروں نے اپنے اپنے کیمپوں کو سجا رکھا ہے۔ادبی گدی نشینوں کی ساری توقیر اطاعت گزاروں کے دم قدم سے ہے، جبکہ اطاعت گزاروں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ ان کے لئے مراعات کا دروازہ ’’کھُل جا سم سم‘‘ کہے بغیر ہی

کھل جاتا ہے۔یوں اطاعت گزاری کے وصف کے باعث انہیں چوتھی کھونٹ کا سفر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور اطاعت گزار ادیب ادب میں چوتھی کھونٹ کے سفر کی ساری صعوبتوں سے محفوظ و مامون رہتے ہیں۔سچ ہے جنہیں اللہ رکھے انہیں کون چکھے!

اطاعت گزاری کا جوہر نہ صرف بغاوت، سرکشی اور انحراف کے جذبات کو ختم کرتا ہے بلکہ انسانی ذہن کو زیادہ سوچنے کے عمل سے روک کر اسے بہت سی مشکلات سے بھی نجات بخش دیتا ہے۔زیادہ سوچنے والے لوگ یعنی آزادانہ طور پر غور وفکر کرنے والے لوگ، جب سوچتے ہیں تو بُرے بھلے میں حدِّ فاصل قائم کرکے تعصب اور آویزش کو ہوا دینے لگتے ہیں۔سقراط اور گلیلیو ایسے ہی باغی لوگ تھے جو ہر وقت ذہن کو استعمال کرنے کی بدعادت میں مبتلا تھے۔صبح وشام غور وفکر میں ڈوبے رہتے اور پھر اپنے باغیانہ خیالات سے اطاعت گزاروں کی نئی نسل کو بھی گمراہ کرتے۔سب جانتے ہیں کہ ان ’’بدبختوں‘‘ کا انجام کیا ہوا۔سچے اطاعت گزار آج بھی ان کے انجام سے عبرت پکڑتے ہیں۔

لیکن کیا واقعی؟۔

یہ سوال میں نے اپنے آپ سے کیا ہے اور اب اس کا جواب سوچ رہا ہوں!

ظاہر ہے جواب سوچنے کے لئے اپنا ذہن استعمال کرنا پڑے گا اور اپنے ذہن کو استعمال کرنے والوں کا انجام مجھے (خاص طور پر مجھے) اچھی طرح معلوم ہے۔

☆☆☆

یہ خیر وشرّ کے سلسلے

خیراورشر کی آمیزش اور آویزش سے نکھریں
بھول اورتوبہ کرتے سارے سانس بسر ہوجائیں

میرے ایک فلم ساز دوست ص۔پ ہیں۔فلمسازی کے میدان میں دو یادگار فلاپ فلمیں چھوڑنے کے علاوہ انہوں نے تیسری فلم مکمل کر کے ڈبے میں ہی بند کردی ہے۔اپنی دوسری فلم میں انہوں نے ایک نئی لڑکی بطور ہیروئن کاسٹ کی۔لیکن ابتدائی مرحلے میں ہی اسے دل دے بیٹھے،شادی کی بات طے ہوگئی۔چنانچہ انہوں نے کوشش کر کے پوری فلم اسلامی مزاج کے مطابق بنائی۔پوری فلم میں ہیرو کو ہیروئن کے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔بس دور ہی دور سے پیار کی پینگیں بڑھائی گئیں۔ہیروئن کو برقع پہنایا گیا۔رقص میں سر سے دوپٹہ نہیں اُترنے دیا گیا۔فلم فلاپ ہوگئی لیکن فلم ساز اور ہیروئن کی شادی کامیاب رہی۔خدا کرے آگے بھی کامیاب رہے۔یہ تعارف تو ضمنی تھا۔اصل بات مجھے یہ بتانا تھی کہ موصوف بے حد محبت کرنے والے انسان ہیں۔جس سے محبت کرتے ہیں اسے اعلیٰ قسم کی شراب ضرور پلاتے ہیں۔اکثر احباب محض شراب پینے کے شوق میں جان بوجھ کراُن کی محبت کا شکار ہوتے ہیں۔میں جب پہلی باراُن کی محبت کی زد میں آیا تو انہوں نے بڑے خلوص سے اپنے گھر پر مدعو کیا اور بڑی محبت کے ساتھ کوئی مہنگی سی شراب میری تواضع کے لئے پیش کی۔میں نے سلیقے سے معذرت کرلی اورانہیں بتایا کہ ابھی تک سگریٹ کے لطف سے بھی محروم ہوں۔بس صرف شاعر دِکھنے کے لئے ایک دو تصویریں ایسی ضرور بنوالی

ہیں کہ جیسے سگریٹ پی رہا ہوں۔اس وقت تو موصوف نے رسمی حیرت کا اظہار کر کے مجھے چھوڑ دیا مگر میرے لئے ان کی محبت اسی طرح موجزن رہی۔چند ملاقاتوں کے بعد وہ مجھے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گئے۔ان کی ہیروئن بیگم بھی ساتھ تھیں۔وہاں انہوں نے شراب کا آرڈر دے دیا۔میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔فائیو اسٹار ہوٹل کا ماحول،دوست کی محبت کی شدت اور ہیروئن بھابی کا مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا اصرار۔

دل نے متعدد دلائل پیش کرنا شروع کردیئے۔دیکھو یار! کسی کی محبت اور خلوص کو ٹھکرانا شراب پینے سے بڑا پاپ ہے۔خود کو نیک سمجھنے والے متکبر ہو کر ابلیس قرار پاتے ہیں۔اس مقام سے بچو۔تھوڑی سی شراب پی لو تاکہ خود کو بہت زیادہ نیک پاک نہ سمجھ سکو۔احساسِ گناہ سے طبیعت میں سوز وگداز پیدا ہوگا اور پھر توبہ کی توفیق ملے گی۔بے شک اللہ تعالیٰ بے حد غفور الرحیم ہے۔ارے یار! جنت میں بھی تو شراب ملنے کی بشارت ہے۔پتہ نہیں جنت میں داخلہ ملتا ہے یا نہیں۔وہاں داخلہ نہ ہوا تو جہنم میں رہ کر بھی شراب کی لذت سے ناآشنا رہو گے۔لعنت ہے ایسی جہنمی پر!

دل کے دلائل ابھی جاری تھے،لیکن شراب ختم ہوچکی تھی۔اب میرے سامنے خالی جام دھرا تھا۔کوئی نشہ نہیں ہوا۔ بعد میں پتہ چلا یہ تو زیٹ تھی جس میں ۱۰فیصد الکوحل ہوتی ہے گویا کوکا کولا سے تھوڑی زیادہ تھی لیکن پھر بھی تھی تو شراب ہی۔چنانچہ احساسِ گناہ غالب ہونے لگا۔میری عادت ہے کہ کوئی بات دل پر بوجھ بننے لگے تو بیوی کو ضرور بتادیتا ہوں چنانچہ میں نے بیوی کو خط لکھ دیا کہ یہاں میں ایک دوست اوراس کی بیوی کا دل رکھنے کے لئے شراب کا ذائقہ چکھ چکا ہوں۔ساتھ ہی اپنی بیوی کا دل رکھنے کے لئے مزید واضح کردیا کہ اس واقعہ سے رنجیدہ یا پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں۔آخر یورپ پہنچ کر بھی مجھے وائن کا ذائقہ تو چکھنا ہی تھا۔یوں گناہ کا احساس تو کم ہوگیا لیکن ایک سوال ذہن میں اٹھنے لگا۔گناہ فی ذاتہٖ کیا ہے؟۔پھر اس سوال سے منسلک متعدد ذیلی سوال اور حقیقت واضح ہونے لگی۔

دُنیا میں کوئی فعل فی ذاتہٖ اچھا یا برا نہیں ہے۔کسی فعل کو آپ مکمل خیر یا شر قرار نہیں

دے سکتے۔مثلاً مرد اور عورت کے تعلق کا جنسی عمل ایک حقیقت ہے۔ مذہبی یا سماجی نقطۂ نظر سے معاملہ صرف یہ ہے کہ جب یہ تعلق شادی کی کاروائی کے بعد استوار ہوتا ہے تو عین ثواب قرار پاتا ہے اور اگر شادی کے بغیر استوار کرلیا جائے تو قابلِ نفرین!۔کسی انسان کو عام حالات میں قتل کر دیا جائے تو ظلمِ عظیم قرار پاتا ہے لیکن اپنے وطن کی حفاظت کے نام پر جنگوں میں ہزاروں، لاکھوں انسان ہلاک کر دیئے جاتے ہیں اور فخر کیا جاتا ہے۔انسانوں کے قاتلوں کو ان کے کارناموں پر تمغۂ عنایت کئے جاتے ہیں۔گویا جنسی عمل ہو یا قتل انسانی۔اپنی ذات میں کوئی فعل نہ اچھا ہے نہ بُرا۔اس کا مذہبی، سماجی یا سیاسی تناظر اسے خیر یا شر کے خانے میں ڈالے گا۔

اگر دنیا کا یہ کارخانہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور اس نے ہر ذرّے میں خواص رکھے ہیں اور ہر ذی روح کو استعدادیں بخشی ہیں تو ہر ذی روح کا کمال یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کی گئی اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو کمال تک پہنچائے۔اگر یہ فارمولا طے ہے تو پھر سور کو آپ لاکھ برا بھلا کہہ لیں اس بے چارے نے کرنا وہی کچھ ہے جو اسے قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔سانپ میں ڈسنے کی استعداد اور بچھو میں ڈنک مارنے کی استعداد بھی تو خدا نے رکھی ہے۔اگر سانپ کسی کو ڈستا ہے یا بچھو کسی کو ڈنک مارتا ہے تو وہ ان کے لئے خیر ہے کیونکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔شر تو اُن کے لئے ہے جو اُن کا شکار ہو رہے ہیں۔لہٰذا سُور ہو، سانپ ہو، بچھو ہو یا میرے کرم فرما شیخ صاحب۔سب اپنے اپنے عمل میں، طور طریقوں میں حق بجانب ہیں۔

جرأت و غیرت اور غنڈہ گردی و ظلم میں تفریق کسی فعل کی نوعیت سے نہیں کی جاتی۔فعل تو ایک ہی ہے۔اگر ہمارے خلاف سرزد ہو رہا ہے تو غنڈہ گردی اور ظلم ہے اور اگر ہم اس کا ارتکاب کر رہے ہیں تو یہ جرأت اور غیرت ہے۔میرے ایک مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ ترقی پسندوں نے ادبی مارشل لا نافذ کیا تھا۔میں نے انہیں بتایا کہ ویسا ہی طرزِ عمل بعض دینی ادب والوں نے بھی اپنا رکھا ہے تو وہ مسکرائے اور بولے بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن ہم اسے مارشل لا کی جگہ ماشاءاللہ کہتے ہیں۔کچھ ایسا ہی معاملہ سچ اور جھوٹ کا ہے۔بعض لوگ صاف گوئی سے کہتے ہیں کہ

دروغ مصلحت آمیز جائز ہے جبکہ بعض لوگ ہر طرح کے جھوٹ کو جھوٹ قرار دے کر بآوازِ بلند **لعنتہ اللہ علی الکاذبین** پڑھتے ہیں لیکن اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جھوٹ سے لے کر دھوکہ دہی تک سب حربے بھی استعمال کر جاتے ہیں اور پھر بڑی معصومیت کے ساتھ اسے مومنانہ فراست اور حکمت قرار دے دیتے ہیں۔میرے کرم فرما شیخ صاحب بھی اسی قماش کے مومن ہیں۔ایک دانشور دوست نے غالباً شیخ صاحب جیسے لوگوں کے لئے ہی کہا تھا کہ باوضو ہو کر گناہ کرتے ہیں اور گناہ کرنے کے بعد بھی باوضو رہتے ہیں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ ہر سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ اور ہر جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہوتا ہے۔مثلاً اگر کوئی شخص تاروں بھرا آسمان دیکھ کر کہے کہ میں اس وقت آسمان پر موجود اتنے سارے ستارے دیکھ رہا ہوں، تو یہ بات بالکل سچ ہوگی۔اس کے باوجود اس میں غیر ارادی جھوٹ بھی شامل ہوگا۔کیونکہ حقیقتاً جن ستاروں کی روشنی ہم تک پہنچ رہی ہوتی ہے وہ اس وقت کی نہیں ہزاروں برس پہلے کی ہوتی ہے۔اس طرح اگر کوئی شخص تیسری دنیا کے بعض ممالک کے غیر انسانی رویوں سے تنگ آ کر مغربی ممالک میں سیاسی پناہ لیتا ہے تو اس کا بیان عموماً ۹۹ فی صد جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا دکھ سچا ہوتا ہے اس لئے اس کے مداوا کے لئے دیا گیا اس کا جھوٹا بیان بھی سچ ہے۔مکمل سچائی تو صرف خدا تعالیٰ کی ہستی ہے۔باقی سب جزوی سچائیاں ہیں اس لئے اپنے جزو پر نازاں ہو کر کسی دوسرے پر انگلی اٹھانے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسی وقت اس کی اپنی باقی ساری انگلیاں خود اُسی پر اٹھی ہوتی ہیں۔

تمام چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔سردی اور گرمی۔بہار اور خزاں۔دن اور رات۔علم ریاضی کا سارا نظام جمع اور نفی پر قائم ہے۔بجلی میں مثبت اور منفی مل کر کرنٹ پیدا کرتے ہیں۔تمام جانداروں میں نر اور مادہ مل کر زندگی کو قائم رکھتے ہیں۔زرتشت مسلک میں دو خداؤں کا تصور ہے۔یزداں، خیر کا خدا۔اور اہرمن، شر کا خدا۔دونوں کے درمیان ازل سے مقابلہ جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔خیر اور شر کی دو بڑی قوتوں کا تصور کسی نہ کسی رنگ میں ہر مذہب میں موجود ہے۔خیر اور شر کی اسی آویزش اور آمیزش سے ہی تو کائنات رنگ برنگی لگتی ہے۔یہ خیر و شر

کے سلسلے کتنے خوبصورت ہیں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہیگل کی جدلیات کا جادو کتنا طاقتور ہے جو آج بھی ساری کائنات کے سر چڑھ کر بول رہا ہے!

☆☆☆

چشمِ تصوّر

تمہارا حسنِ خداداد تو نہ رہ پایا
مگر فقیر کا حسنِ خیال باقی ہے

مجھے پانچ چھ سال کی عمر میں ہی خدا اور قیامت کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں بتا دی گئی تھیں، جن میں سے بہت کم باتیں میری سمجھ میں آسکیں۔ تاہم ان تمام باتوں کا مجموعی تاثر ایک خوف کی صورت مجھ پر مسلّط ہو گیا۔ مکمل فنا (قیامت) کا تصوّر مجھ پر گھبراہٹ طاری کر دیتا۔ میں چشمِ تصوّر سے دیکھتا کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے کہیں کچھ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہولناک خلا کا تصوّر میرے ذہن میں آتا اور میرا دل جیسے اس خلا میں ڈوبنے لگتا۔ پھر کبھی میں چشمِ تصوّر سے دیکھتا کہ ساری کائنات تو موجود ہے لیکن انسان کا وجود نہیں ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی مجھ پر ایک عجیب سا اضطراب طاری ہو جاتا اور میں خدا سے دعا کرنے لگتا کہ مولا!۔۔ میں بے شک نہ رہوں مگر یہ دنیا اور اس دنیا میں انسانی زندگی کو کبھی ختم نہ کرنا۔ دعا کرنے کے باوجود میں خدا کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچ پاتا تھا۔ اس کی ہستی کو جاننے اور سمجھنے کی ایک اُلجھن سی رہی۔

ایک مدت کے بعد میرے چھوٹے بیٹے ٹیپو کی ایک معصومیت نے میرے بچپن کی اُلجھن دور کر دی۔ میرے والد کی وفات پر ٹیپو کو معاملہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ دادا اَبو کو کیا ہو گیا ہے، جاگتے کیوں نہیں؟۔ جب اسے بتایا گیا کہ اب وہ کبھی نہیں جاگیں گے کیونکہ

اللہ میاں نے انہیں اپنے پاس بلالیا ہے تو دادا پوتے کی محبت کے جوش میں اس نے غصّے سے کہا: میں اللہ میاں کو ماردوں گا۔اس پر اسے فوری طور پر سمجھانا پڑا کہ اللہ میاں کے بارے میں ایسی بات کہنا گناہ ہے کیونکہ وہ بہت بڑا ہے۔اللہ میاں کی بڑائی کا سن کر ٹیپو نے پوچھا: کیا اللہ میاں دادا اَبو سے بھی بڑا ہے؟ جب اسے باور کرایا گیا کہ وہ سب سے بڑا ہے تب اس نے اس کی بڑائی کا کچھ اندازہ لگایا۔شاید چشمِ تصوّر سے کچھ دیکھا۔اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں پیچھے کی طرف جتنا لے جا سکتا تھا، لے جا کر پوچھا: کیا اللہ میاں اتنا بڑا ہے؟۔اسی لمحے میں مجھے جیسے اپنے بچپن کی سوچ کا جواب مل گیا۔ایک چھوٹا سا بچہ جس حد تک اپنے بازو پھیلا سکتا ہے اسی حد تک بڑائی کا سوچ سکتا ہے۔اس سے زیادہ بڑی شے اس کے نزدیک ہو ہی نہیں سکتی۔تب ہی مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ خدا کے بارے میں مختلف عقائد رکھنے والے تمام مذاہب اور فرقے خدا کے معاملے میں ایسے معصوم اور سچے چھوٹے بچے ہیں جنہوں نے خدا کی عظمت، مقام اور بڑائی کو سمجھنے کے لئے اپنے اپنے ننھے منّے بازو پھیلا رکھے ہیں۔جس کے بازو جہاں تک پھیل سکتے ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو سمجھ رکھا ہے اور دوسروں کو بھی وہی خدا منوانے پر مُصر ہے۔

پھر میں نے چشمِ تصوّر سے اس عظیم تخلیق کار کی تخلیق اس کائنات پر غور کیا تو اسی کی طرح اس کی تخلیق بھی بے انت نظر آنے لگی۔کائنات کی بڑی سطح جس میں کروڑوں کہکشائیں، اربوں نظام شمسی اور کھرب در کھرب سیارے موجود ہیں اور جس کا کوئی انت معلوم نہیں ہوتا، اس کی انتہا معلوم کرنا تو دور کی بات ہے۔سائنس ابھی تک چھوٹی کائنات یعنی ایٹم کا کوئی انت تلاش نہیں کر سکی۔پہلے پہل کہا گیا کہ ایٹم مادے کا بلڈنگ بلاک ہے بعد میں اسی ایٹم کے چالیس سے زائد پارٹیکلز دریافت ہوگئے۔بات QUARKS تک پہنچی مگر پھر اس کے بھی مزید چھ کلرز سامنے آگئے۔QUARKS سے ’’ہیڈرونز‘‘ بنتے ہیں۔’’نان ہیڈرونز‘‘ کس سے بنتے ہیں؟ اس کا ابھی کوئی علم ہی نہیں ہے۔گویا بڑی کائنات کی انتہا تو کجا چھوٹی کائنات کی انتہا بھی معلوم نہیں کی جاسکتی۔بس ایک جہانِ حیرت ہے، اسے طے کیجئے تو آگے اس سے بھی بڑا جہانِ حیرت موجود ہوتا ہے۔حیرانی کا یہ تہ در تہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔شاید اسی لئے شاعر نے کہا تھا:

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ پیدا ہوگئے ہیں اور حیرانی نہیں جاتی

میرے ایک دانشور دوست نے لکھا تھا کہ سارے نظام شمسی، کہکشائیں اور بلیک ہولز دراصل ایک ایٹم کے الیکٹرون ہیں۔اس انکشاف سے میں ایک مسرّت آمیز حیرت سے دوچار ہوا۔واقعی اگر یہ ساری کائنات الیکٹرون کا درجہ رکھتی ہے تو یہ تو صرف ایک فی صد ہے۔اگرچہ ہمارے لئے یہ ایک فی صد بھی بے انت ہے مگر ۹۹ فی صد تو نیوکلس کے اندر ہے اور نیوکلس کا پتہ ہی نہیں چل رہا۔اپنے دانشور دوست کی اس بات پر حیرت اور مسرّت کے اُسی لمحے میں، میں نے چشمِ تصوّر سے دیکھا کہ ہماری دھرتی کے کسی ایک ایٹم کے کسی پارٹیکل میں کوئی مخلوق آباد ہے اور اس کے ’’سائنس دان‘‘ اپنی دھرتی کے ایٹم کی دریافت کے بعد اس کے پارٹیکلز پر تحقیق میں مشغول ہیں۔تب مجھے زمان و مکان کی لامحدودیت کا کچھ اندازہ سا ہونے لگا۔

کون و مکان کی باتیں اپنی جگہ۔ہماری اس دھرتی پر انسانی زندگی کی ساری ترقی چشمِ تصوّر کی عطا ہے۔انسان نے پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھا تو اس کے دل میں پرواز کی ہلکی سی خواہش پیدا ہوئی۔اُس زمانے کے داستان گوؤں نے اس خواہش کی تکمیل کے لئے چشمِ تصوّر سے کام لیا اور پھر اُن کی داستانوں میں جن، دیو، پریاں، اُڑن قالین اور اُڑن کھٹولے پرواز کرنے لگے۔ان داستانوں نے نسل در نسل انسانوں کے دل میں اڑنے کی خواہش جگائے رکھی جس کے نتیجہ میں آخر کار تیز رفتار سواریاں، ہوائی جہاز اور راکٹ تک ایجاد ہوگئے۔دوسری تمام ترقیات کا تعلق بھی بنیادی طور پر چشمِ تصوّر سے ہے۔

میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ فلمیں دیکھے بغیر بسر کیا ہے تاہم اس زمانے میں، میں نے بے شمار گیت سنے تھے۔پھر جب میں نے فلمیں دیکھنا شروع کیں تو اپنے پسندیدہ گیتوں میں سے کسی بھی گیت کی پکچرائزیشن مجھے اچھی نہیں لگی۔دراصل گیت سنتے ہوئے ہمارے تصوّر کی آنکھ وا ہوتی ہے اور وہ اس گیت پر اپنی مرضی کا سین فلم بند کرتی ہے۔ایسے سین میں جو بے پناہ معنویت ہوتی ہے ہماری چشمِ تصوّر کا کمال ہوتی ہے۔جبکہ فلمی سین کسی نظریاتی نقاد کی طرح پارٹی لائن کے

مطابق اسے محدود معنی میں بند کر کے اس کی وسعت میں روک بن جاتا ہے۔اب کسی فلم میں میری پسند کا کوئی گیت آ جائے تو میں اپنی دونوں آنکھیں موند کر چشمِ تصوّر روا کر لیتا ہوں۔تب میں دیکھتا ہوں کہ اس سین کا ہیرو میں خود ہوں۔میں خود وہ گیت گا رہا ہوں۔میری کوئی محبوبہ یا بعض اوقات مجبوراً میری بیوی میرے روبرو ہے۔میرا انداز اتنا بے ساختہ اور فطری ہے کہ فلمی سین کے اداکار کی مصنوعی اداکاری اس کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتی۔اگر ہیروئن کا گایا ہوا گیت ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ وہ جذبات میرے حضور پیش کئے جا رہے ہیں۔شاید اسی لئے جب میں کوئی خوبصورت گیت سنتا ہوں تو وہ گیت سیّال صورت اختیار کر کے میری رگوں میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔

چشمِ تصوّر انسان کو جینے کا حوصلہ بخشتی ہے۔کسی شخص کے حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں وہ چشمِ تصوّر سے اپنے آنے والے اچھے دن دیکھ سکتا ہے۔چاہے بالکل نہ دکھائی دے رہے ہوں پھر بھی دیکھ سکتا ہے۔دکھ اور تکلیف میں آرام اور سکون کا،سردی میں گرمی اور گرمی میں سردی کا،دجلہ میں قطرہ اور قطرہ میں دجلہ کا نظارہ کر سکتا ہے۔میری پرانی محبتیں جو اَب بال بچوں میں گھِر کر محبت کے ہجّے تک بھول چکی ہیں،جن کے ڈھلکے ہوئے جسموں اور چہروں پر جھریوں کے آثار دنیا کو دیدۂ عبرت نگاہ بنا چکے ہیں۔میں چشمِ تصوّر میں انہیں آج بھی اسی طرح جوان،شوخ اور سرسبز،شاداب دیکھ رہا ہوں جیسا وہ دس،پندرہ یا بیس سال پہلے تھیں۔جوانی کے ایام پر ہی کیا موقوف ہے۔جب بھی جی چاہتا ہے میں چشمِ تصوّر سے اپنے بچپن اور لڑکپن کے دنوں کو اسی طرح ہنستا کھیلتا دیکھ لیتا ہوں۔امی،ابو،بابا جی۔جن بزرگوں اور عزیزوں کو فوت ہوئے زمانہ گزر گیا ہے انہیں بھی اُنہیں یادوں کے ساتھ اُسی حالت میں دیکھ لیتا ہوں۔گویا چشمِ تصوّر پر نہ صرف زمان و مکان اثر انداز نہیں ہو پاتے بلکہ یہ ارواح کو بھی طلب کر سکتی ہے۔

چشمِ تصوّر ہمیں جاگتے میں خواب دکھاتی ہے۔لگن سچی اور قسمت اچھی ہو تو خوابوں کی تعبیریں بھی مل جاتی ہیں۔لیکن جس طرح نیند میں دیکھے جانے والے کئی خواب بدہضمی کا نتیجہ ہوتے ہیں اسی طرح چشمِ تصوّر سے جاگتے میں دیکھے جانے والے بعض خواب بھی تصوراتی بدہضمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ایسے خوابوں کو شیخ چلی کے خواب بھی کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

اپنا اپنا سچ

کعبے میں جا کے یا کہیں پتھر تراش کر
ممکن ہو جس طرح بھی خدا کو تلاش کر

دُنیا میں ہر گروہ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ خود کو سچا سمجھتا ہے۔ایسا سمجھنے میں کوئی حرج نہیں۔خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جب اپنی سچائی کا اعلان کرنے والا ساتھ ہی دوسروں کو جھوٹا بھی قرار دے دیتا ہے۔ہر شعبۂ حیات میں ہر گروہ اپنے حق بجانب ہونے کے دلائل بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے جھوٹا ہونے کے ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ایسی صورتحال میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم کسے جھوٹا کہیں اور کسے سچا سمجھیں۔شاید یہ معاملہ کچھ ایسے ہی ہے کہ جب کوئی خود کو سچا کہتا ہے تو گویا اپنے خوبصورت ہونے کا اعلان کرتا ہے لیکن پھر ساتھ ہی دوسروں کو بدصورت بھی قرار دیتا ہے۔اصولاً کسی کو اپنی خوبصورتی کے ثبوت کے لئے دوسروں کی بدصورتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔اگر آپ خوبصورت ہیں تو کسی کی بدصورتی کی نشاندہی کئے بغیر بھی آپ خوبصورت ہیں،لیکن اگر آپ بدصورت ہیں تو بے شک سارے جہان کی بدصورتی ثابت کر دیجئے اس سے آپ کا خوبصورت ہونا ثابت نہیں ہو سکے گا۔چونکہ ہم اصلاً سچائی کی بات کر رہے ہیں اس لئے مختلف گروہوں اور افراد کی سچائیوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہے اور ہر کسی کو اپنے اپنے سچ کی حفاظت کرنی چاہئے۔نظریاتی سچ کی حفاظت نظریات پر عمل پیرا ہونے سے ہوتی ہے۔

آئینے کو ہمارے ہاں سچ کی بڑی علامت بنالیا گیا ہے اسی لئے ہر کوئی خود آئینہ دیکھنے کی بجائے دوسروں کو آئینہ دکھانے میں لگا ہوا ہے۔ بے شک عام طور پر آئینہ جو کچھ دیکھتا ہے وہی ہمیں دکھادیتا ہے۔ اس لحاظ سے آئینہ سچا بھی ہے لیکن کچھ اتنا زیادہ بھی سچا نہیں ہے۔ مثلاً کبھی کوئی تحریر آئینے کو دکھایئے، اچھی بھلی اُردو کو عبرانی تحریر بنا کر دکھادے گا اور عبرانی بھی ایسی جو عبرانی کے استادوں کے پلّے بھی نہ پڑے۔ پھر ایسے آئینے بھی ہیں جو اچھی بھلی صورت کو بگاڑ کر دکھاتے ہیں۔ گورے چٹے رنگ کو کالا کر کے پیش کر دیتے ہیں۔

آئینے کی طرح پانی کی سچائی میں بھی زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ مختلف رنگوں کے گلاسوں میں پانی ڈال کر دیکھ لیں۔ ہر رنگ کے گلاس کا پانی اسی رنگ کے مطابق نظر آئے گا۔ اس کا شفّاف پن کہیں بھی نظر نہ آئے گا۔ اس کے باوجود پانی کی سچائی پر کبھی انگلی نہیں اٹھائی گئی۔ اس کے برعکس گرگٹ بیچارے کو ہر کوئی لعن طعن کرتا ہے جبکہ اس کا گناہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ آئینے اور پانی کی طرح یہ بھی جو کچھ دیکھتا ہے یا جہاں سے گزرتا ہے اسی رنگ میں رنگین نظر آنے لگتا ہے۔ آئینہ، پانی اور گرگٹ تینوں اپنی اپنی جگہ سچے ہیں اور کسی ایک کی تعریف کر کے دوسرے کو مطعون کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کسی شے یا عمل کا جواز پیش کرنے والے ناجائز کو جائز اور جائز کو ناجائز بنانے کا ہنر دکھاتے ہیں۔

اس دنیا میں اربوں کی تعداد میں انسان موجود ہیں۔ سب کے تمام اعضا ایک جیسے ہیں۔ اتنی گہری یکسانیت کے باوجود ہر انسان دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہے۔ اس کا دوسروں سے کچھ مختلف ہونا اس کی ذاتی شناخت ہے اور یہی اس کا ذاتی سچ ہے۔ پھولوں کو دیکھیں ہزار ہا اقسام کے اور رنگا رنگ پھول ہیں۔ اس کے باوجود ہر پھول ایک قدرِ مشترک رکھنے کے باوجود ہر دوسرے پھول سے مختلف ہے۔ پھولوں، پودوں کو چھوڑیں، پتھروں کو دیکھ لیں۔ پتھروں کو جمع کرنے کا شوق رکھنے والے حضرات اور پتھروں سے سر پھوڑنے والے عشّاق بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا میں ایک جیسے دو پتھر بھی نہیں ملتے۔ گویا اصل سچائی بیک وقت یکسانیت اور اختلاف کے امتزاج سے اُبھرتی ہے۔ ان انفرادی مثالوں سے گروہی اور نظریاتی سچائیوں کی حقیقت کو بھی سمجھا

جاسکتا ہے۔ ہر گروہ کی اپنی اپنی سچائی ہے۔ اپنی اپنی سچائی کو ایک اور رنگ میں اپنی اپنی بیوی سے بھی مشابہت دے سکتے ہیں۔ کسی کی خوبصورت بیوی کو دیکھ کر بعض لوگ بدنیت ہو کر اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں کامیابی نہ ہو تو پھر محرومی اور حسد کے باعث اس کی بدکرداری کی فرضی داستانیں گھڑ کر پھیلانے لگتے ہیں چاہے اس انہماک کے دوران اپنی بیوی کہیں اور مصروفِ عمل ہو چکی ہو۔ ایک اچھے مرد کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنی بیوی پر قناعت کرے۔ دوسروں کی بیویوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی بجائے اپنے اور اپنی بیوی کے مشترکہ تخلیقی عمل میں مگن رہے اور اسی طرح زندگی میں اضافہ کر کے زندگی کی جنت کا نظارہ کرتا رہے۔ اسی طرح مختلف نظریاتی گروہوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی اپنی سچائی کے ذریعے اپنی تعداد بڑھائیں، بلاوجہ دوسروں کی سچائیوں کو بدنیتی سے نہ دیکھیں اور نہ ہی حسد کے ساتھ ان پر الزام تراشی کریں۔ میں ان سارے نظریات کے ماننے والوں کو سلام کرتا ہوں جو دوسروں کی عیب چینی کرنے کی بجائے صرف اپنی خوبیوں کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

جس جگہ میرا گھر ہے، ایک پولٹری فارم اور ایک ڈیری فارم وہاں سے قریب پڑتے ہیں۔ ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر پولٹری فارم کے حوالے سے اپنی بات آگے بڑھانا مشکل ہے کہ اس سے تحریر میں فحاشیت پیدا ہو جانے کا ڈر ہے اس لئے ڈیری فارم کے حوالے سے ہی کچھ عرض کئے دیتا ہوں۔ ہر نظریہ اپنی جگہ خالص دودھ کی طرح ہے۔ مختلف بنیادی نظریات میں اس دودھ کی مقدار میں کمی بیشی مانی جاسکتی ہے۔ مثلاً ایک نظریہ بنیادی طور پر پانچ من دودھ کا سچ ہے اور دوسرا دَس من کا۔ سو دونوں میں خالص دودھ کی یکسانیت اور مقدار کا فرق واضح ہے۔ اب قصہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ کوئی بھی بنیادی نظریہ مختلف تشریحات کے باعث، بعض رہنماؤں کی خواہشات کے باعث اور بعض اوقات زمانے کے تبدیل شدہ تقاضوں کے باعث تھوڑے وقفے کے بعد گروہ در گروہ ہونے لگتا ہے۔ پانچ من والے کے اگر ۵۰ گروہ بن گئے تو مجموعی طور پر ہر گروہ کے حصے میں چار کلو دودھ آئے گا۔ لیکن چونکہ ہر گروہ کا دعویٰ ہوتا ہے کہ اس نظریے کا پورا اور خالص دودھ صرف ہمارے پاس ہے اس لئے انہیں بنیادی مقدار پوری کرنے کے لئے اس میں چار من ۳۶ کلو پانی

ملانا پڑتا ہے اور اتنی ملاوٹ کے باوجود (''بانگ دہل'' کے مصنف سے معذرت کے ساتھ) بانگ دہل دعویٰ کریں گے کہ خالص اور پورا پانچ من دودھ صرف ہمارے پاس موجود ہے باقی سب جھوٹ بولتے ہیں۔ایسے دعویداروں میں جو سادہ قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ تو کثیر پانی ملا دودھ ہی لئے بیٹھے ہوتے ہیں جس میں چار کلو دودھ موجود ہونے کے باوجود اپنے ''نہ ہونے'' کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔جبکہ بعض کاری گر قسم کے لوگ رنگ بازی سے کام لے کر پانی کو دودھیا کر لیتے ہیں چاہے اس میں مصنوعی دودھ پاؤڈر ملائیں چاہے چونا۔مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ دیکھنے والا دھوکہ کھا جائے اور انہیں کو اس نظریے کا اصل محافظ مان لے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہر نظریہ ایک جزوی سچائی ہے۔کامل سچائی صرف اور صرف وہ حقیقتِ عظمیٰ ہے جو خالقِ کائنات ہے۔جو اس کائنات میں جاری و ساری بھی ہے اور اس سے باہر بھی ہے جو ہر شے پر محیط ہے۔اس کامل سچائی کا اپنی اپنی بساط کے مطابق صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے،احاطہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ لامحدود ہے۔جب ایک بوند روشنی کا مالک جگنو سورج کی اصل تپش کا اندازہ نہیں کر سکتا اور ایک قطرہ سمندر کی وسعت اور گہرائی کا ادراک نہیں کر سکتا تو ہم سارے انسان اس عظیم ہستی،اس لامحدود سچائی کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں جس کے لئے کامل سچائی کا لفظ بھی نامکمل لگتا ہے۔



تجربہ اور تجربہ کاری

چالاکی کہاں آتی تھی حیدرؔ کو مری جان
بس تیری اداؤں کی کرامات سے آئی

زندگی کے تجربات اور تجربہ کاری دو الگ الگ چیزیں ہیں۔زندگی کے تجربات زندگی کو معصومانہ حیرت سے دیکھنے اور پھر اس کی جستجو کے سفر سے عبارت ہیں۔یہ حیرت اور جستجو اجتماعی نوعیت کی ہے کیونکہ اس سے پوری انسانیت فیض یاب ہوتی ہے۔پتھر کے زمانے سے کمپیوٹر کے زمانے تک انسانی زندگی کے تجربات کے ثمرات دیکھے جا سکتے ہیں۔جستجو کے اس سفر میں انسان اپنے ہر قدم پر حیرت میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر اسی معصومانہ حیرت کے ساتھ جستجو کا اگلا قدم اٹھاتا ہے۔اس کے برعکس تجربہ کاری کی ساری کاری گری ذاتی نوعیت کی ہے۔اس سے محض کوئی شخص، گروہ یا طبقہ فائدہ اٹھاتا ہے۔فائدے کے حصول کے لئے ہر جائز و ناجائز حربے کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔اسی لئے تجربہ کاری انسانی معصومیت پر کاری ضرب ہے۔یہ کسی معصوم بچے کا گرگِ باراں دیدہ بن جانے کا المیہ ہے۔

جمالیاتی حس رکھنے والے لوگ فطرت کے مناظر اور مظاہر کو دیکھ کر انوکھی سی روحانی آسودگی محسوس کرتے ہیں جبکہ تجربہ کاری کے ہنر سے آشنا لوگ ایسی روحانیت کو فضولیات میں شمار کرتے ہیں۔چنانچہ مسکراتے ہوئے گلاب دیکھ کر گلقند بنانے کا پلانٹ لگانے پر غور کرتے ہیں،پہاڑوں کو دیکھ کر بجری کے بزنس کا سوچتے ہیں،دریاؤں کو دیکھ کر کسی بھی ضروری یا غیر ضروری

جگہ پرایک اورپُل بنوانے کی اسکیم کی منظوری اورپھراس کا ٹھیکہ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی تدبیر کرتے ہیں، جنگلات انہیں لکڑی چوری کرانے پر اکساتے ہیں۔ ہر چیز میں مادی افادیت کا پہلو انہیں اپنی طرف بلا لیتا ہے۔ ہمارے افادی ادب والے حضرات کا رویّہ بھی ادب کے ساتھ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ افادی ادب کی تجربہ کاری نے انہیں بڑی حد تک ادب سے ہی بے نیاز کر دیا ہے۔ تجربہ کار افادی ادب والے ادبا اچھا ادب بے شک تخلیق نہ کر سکیں افادی ادب اور اپنی تجربہ کاری کی برکت سے مادی فوائد ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ نجی افادیت کی اہمیت سے آشنا ہونے کے بعد بے شمار ذاتی فوائد کی خواہشات کے سامنے انہیں ادب بے حد حقیر لگتا ہے۔ محض ایک آلہ۔۔ چنانچہ ایسے لوگ ادب کو آلۂ کار بنا کر فائدے سمیٹتے رہتے ہیں۔

مجھے ایک شعلہ بیان مقرر کی چند تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے یہ بات شدّت سے نوٹ کی کہ کسی غم انگیز واقعہ کے بیان کے وقت شدّتِ غم سے ان کا گلا رندھ جاتا ہے آواز کی لرزش سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کے آنسو بھی نکل آئے ہوں گے۔ لیکن گلا رندھنے کی کیفیت ختم ہونے سے پہلے ان کی شعلہ بیانی پھر اپنا جادو جگانے لگتی۔ میں نے اپنی ذات کے حوالے سے بہت غور کیا۔ اگر مجھ پر غم کی حالت طاری ہو اور گلا رندھ جائے تو بے شک آنسو نکلیں یا نہ نکلیں، دیر تک میری آواز نہیں نکل پاتی۔ میں کوشش کرنے کے باوجود بول نہیں پاتا چہ جائیکہ اسی لمحے شعلہ بیانی کر سکوں۔ چنانچہ میں نے مذکورہ شعلہ بیان مقرر کے ایک مرید سے ان کے مرشد کی کیفیت اور اپنی کیفیت کے فرق کا سبب پوچھا تو خوش عقیدہ مرید نے اسے مرشد کی کرامت قرار دیا لیکن اس کے ایک پیر بھائی جو کچھ کھلّے ڈلّے سے آدمی تھے کہنے لگے یہ ہمارے مرشد کے وسیع تجربے کا ثمر ہے۔ ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وسیع تجربے سے ان کی مراد یہی تجربہ کاری تھی۔ یہ وہی تجربہ کاری ہے جو اپنی عیاری کو حکمت اور دوسروں کی دفاعی حکمت کو بھی مکاری قرار دیتی ہے۔

تجربہ کاری۔۔۔ اخلاص، محبت، دیانتداری، ذاتی شرافت اور دیگر اعلیٰ انسانی اوصاف کو چنداں اہمیت نہیں دیتی۔ یہ تمام اوصاف رکھنے کے باوجود اگر کوئی تجربہ کار لوگوں کے فائدے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر حارج ہو رہا ہے تو اپنی تمام تر انسانی خوبیوں کے باوجود وہ راندۂ

درگاہ ہے۔ اس کے برعکس اگر ٹھگ، لٹیرے، غنڈے اور قاتل قسم کے لوگوں سے مشن کو تقویت مل رہی ہے تو ان کے اخلاص، محبت، دیانت اور شرافت کے گن گائے جائیں گے۔ تجربہ کاری کا یہ اصول ہے کہ جو چیز اپنے مطلب اور فائدے کے مطابق ہے وہی سچائی ہے، باقی سب جھوٹ ہے۔ خدا کی سچی عبادت جو اپنا اجر آپ ہوتی ہے، تجربہ کار لوگوں نے اس کی لذّت بھی جنّت کی لالچ اور دوزخ کے خوف سے جوڑ دی ہے۔ شاید اسی لئے حضرت رابعہ بصری کو وہ دعا مانگنا پڑی جس میں خدا کی عبادت کسی بھی لالچ اور خوف سے پاک نظر آتی ہے اور جس کی لذّت ہی سب سے بڑی جنت ہے۔

یوں تو دنیا کے سارے ڈپلومیٹس تجربہ کاری کے زائیدہ ہیں لیکن دنیا کی واحد سپر پاور کے ڈپلومیٹس نے تجربہ کاری کی انتہاؤں کو چھُو لیا ہے۔ جن مخصوص ممالک سے ان کے مفادات وابستہ ہیں وہاں کسی کو کانٹا بھی چبھ جائے تو واشنگٹن میں ان ڈپلومیٹس کا بچہ بچہ بے تاب ہو جاتا ہے لیکن جن خطّوں سے ان کے مفادات لگّا نہیں کھاتے، وہاں انسانی خون بیدردی کے ساتھ پانی کی طرح بھی بہایا جا رہا ہو تو ان کی بے فکری دیدنی ہوتی ہے۔ یہ ڈپلومیٹس دنیا بھر میں جمہوریت کے نفاذ کے علمبردار ہیں لیکن اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے بعض ملکوں میں نہ صرف بادشاہتوں کو تحفّظ فراہم کرتے ہیں بلکہ جہاں اپنا فائدہ نظر آئے وہاں جمہوریت کا خاتمہ کر کے فوجی آمریت بھی مسلّط کر دیتے ہیں۔ یہ کھیل تماشہ محض ڈپلومیسی یا سیاست نہیں بلکہ تجربہ کاری کا کمال ہے۔

علم ایک ایسا سمندر ہے جس میں انسان جتنا آگے بڑھتا ہے یہ اتنا ہی وسیع اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ علم کے حصول میں آگے بڑھنے والا جتنا آگے بڑھتا ہے اتنا ہی اس کی علمی بے مائیگی کا احساس بڑھتا جاتا ہے لیکن تجربہ کاری کا ہنر جاننے والوں کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اپنے واجبی علم کی خامیوں کو چھپا کر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے علم کا اظہار کریں گے۔ ایسے ہی ایک تجربہ کار صاحبِ علم کو جب میں نے بتایا کہ میں فارسی زبان نہیں جانتا تو انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا اظہار نہ کرنا ورنہ تمہاری سبکی ہوگی کہ اُردو کا ادیب ہے اور فارسی نہیں جانتا۔

میں نے مودبانہ گزارش کی کہ میں جتنا ہوں اتنا ہی دِکھنا چاہتا ہوں (جتنا دِکھتا ہوں یار لوگوں کو اتنا بھی دُکھتا ہوں) پھر اس میں سُبکی کہاں سے آ گئی؟ لیکن موصوف پھر بھی پورے خلوص سے مجھے اپنی نصیحت پر عمل کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ان کی تجربہ کاری آج بھی ان کے کام آ رہی ہے۔ ان پر کیا موقوف۔ ہمارے ہاں مجلسی نوعیت کے ناقدین اور ''صاحبانِ علم'' اپنی تجربہ کاری کا آپ ثبوت ہیں۔

میں ابتدا میں کسی معصوم بچے کی طرح سادہ تھا۔جس سے محبت اور خلوص کا اظہار کرتا اس سے سچ مچ محبت اور خلوص کا رشتہ محسوس ہوتا۔رفتہ رفتہ دوسروں کے رویّوں سے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں کسی ''پینڈو'' کی طرح کسی بہت بڑی آبادی والے شہر کی پُر ہجوم ٹریفک میں گھِر گیا ہوں۔ رشتے، دوستیاں، محبت، ادب، ٹریڈ یونین، مذہب۔ زندگی کے ہر شعبے میں مجھے بے لوث اور محبت کرنے والے لوگ بھی نصیب ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر میں لوگوں کی تجربہ کاری کا نشانہ بنتا رہا ہوں۔ یار لوگ میری سادگی اور خلوص سے فائدہ بھی اٹھاتے اور بعد میں اس سادگی اور خلوص کو میری بیوقوفی قرار دے کر مجھ پر ہنستے۔فائدے اٹھا کر آنکھیں بدل لینے والے دوستوں اور تضحیک کرنے والے کرم فرماؤں کے رویوں پر میں ایک عرصے تک حیران ہوتا رہا۔لیکن اب میری حیرانی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ یار لوگوں کی تجربہ کاری کا نشانہ بنتے بنتے شاید میں بھی اب تھوڑا بہت تجربہ کار ہو گیا ہوں۔

پتہ نہیں تجربہ کار ہو گیا ہوں یا اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں!

☆☆☆

حیدر قریشی کے انشائیے

منزّہ یاسمین (بھاول پور)

اُردو کی دوسری نثری اصناف یعنی ناول، افسانے اور ڈرامے کی طرح انشائیہ بھی مغرب سے آیا۔اُردو میں انشائیہ ایک نو خیز صنفِ ادب ہے جس پر طعن و تشنیع کی بہت گرد اڑائی گئی مگر اس کے نقوش پھر بھی دھندلے نہ ہو سکے اور انشائیہ اپنی پوری قوت کے ساتھ شہرت اور مقبولیت کی راہ پر گامزن رہا۔خاطر غزنوی انشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انشائیہ، انگریزی نثر کی ایک صنف ESSAY کی اُردو صورت ہے۔لفظ ESSAY فرانسیسی لفظ ESSAI سے انگریزی زبان نے لیا۔ظہیر الدین مدنی اپنے مقالے میں ESSAY کی اصل عربی لفظ السّعی کو بتاتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ صدیوں تک اندلس اور جنوبی فرانس پر عربوں کا سکّہ چلتا رہا۔اسی وجہ سے فرانسیسی زبان میں لاطینی سے بھی زیادہ عربی الفاظ رائج ہیں۔ممکن ہے ESSAI بھی ان میں سے ہو۔کیونکہ دونوں الفاظ کے معنی اور مفہوم کوشش کے ہیں۔آج کل اُردو زبان میں اسی صنف کو انشائیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔'' (۱)

محمد وسیم انجم اپنے مضمون ''حیدر قریشی کے انشائیے'' میں انشائیہ کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''انشائیہ دراصل مضمون ہی کی ایک قسم ہے، یہ ایسی نثری تحریر ہے جس میں انشائیہ نگار غیر رسمی اور شگفتہ انداز میں اپنا مافی الضمیر قاری تک پہنچاتا ہے۔ انشائیے کے لیے ایسے موضوع کو منتخب کیا جاتا ہے جس میں کوئی نیا پہلو قاری کے سامنے آئے اور وہ اپنے ذہن میں ایک

دریچہ سا کھلتا ہوا محسوس کرے۔ اس موضوع کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنے کی بجائے صرف ان انوکھے گوشوں کو منتخب کیا جاتا ہے جو قاری کو چند لمحوں کی مسرت بہم پہنچا سکیں۔ علاوہ ازیں اسلوب بیان کی یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ تفصیل و توضیح کی بجائے کم سے کم الفاظ میں مطلب ادا ہو جائے ''۔ (۲)

اُردو ادب میں انشائیہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ڈاکٹر وزیر آغا کے پہلے انشائیوں پر مبنی مجموعہ ''خیال پارے'' سے ہوا جو کہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا اور اُردو ادب میں یہ پہلا انشائیوں کا مجموعہ بھی کہلاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر وزیر آغا کو صنفِ انشائیہ کا بانی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اُردو انشائیہ کا بانی قرار دیتا ہوں تو اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس صنف کی بنیادی بوطیقا وضع کی ہے۔ اور اس بوطیقا کے مطابق انشائیے تخلیق کیے ہیں، دوسری طرف بات یہ کہ انہوں نے ''پرسنل ایسّے'' کے جس اسلوب کی ترویج و اشاعت کی اس اسلوب میں انشائیہ لکھنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا کی''۔ (۳)

انشائیہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو پہلے وزیر آغا اس اسلوب کے تنہا انشائیہ نگار تھے۔ پھر انہی کے انداز پر پروفیسر مشتاق قمر اور پروفیسر جمیل آذر نے بھی انشائیے لکھنے شروع کر دیئے۔ بعد میں ڈاکٹر وزیر آغا کے مخصوص انداز میں انشائیہ لکھنے والوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ان انشائیہ نگاروں کی ایک فہرست پروفیسر جمیل آزر نے اپنے مقالے ''اُردو انشائیہ نگاری کے پچاس سال'' مطبوعہ ''اوراق'' جولائی اگست ۱۹۹۷ء میں شامل کی ہے۔ جن میں حیدر قریشی کا نام بھی شامل ہے۔ (۴) اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون ''اُردو انشائیہ کی کہانی'' میں بھی چند انشائیہ نگاروں کی فہرست پیش کی ہے، جس میں حیدر قریشی کا نام بھی شامل ہے۔

حیدر قریشی اپنے مضمون ''عہد ساز شخصیت'' میں وزیر آغا سے اپنے تلمذ کا اِن لفظوں میں اعتراف

کرتے ہیں:

''وزیر آغا نے مجھے انشائیہ کے بارے میں زبانی گفتگو میں بھی سمجھایا، مضامین کے مطالعہ کی طرف بھی لگایا اور پھر انشائیے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔'' (۵)

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں منفرد اور متنوع موضوعات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے انشائیے تخلیق کیے ہیں جن میں اختصار، غیر رسمی طریق کار، شگفتگی، اسلوب اور انکشاف ذات کے منفرد عوامل شامل ہیں۔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں بھی اپنے شاعرانہ انداز کو متعارف کرواتے ہوئے ہر انشائیے کے آغاز میں موضوع کے مطابق ایک ایک شعر تحریر کیا ہے جو کہ انشائیے کے تاثر کو مزید اُجاگر کرنے میں مدد دیتا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں میں زندگی کی حقیقتوں کو اُن کی مکمل معنویت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشائیہ ''خاموشی'' میں حیدر قریشی اپنے منفرد اور فکر انگیز انداز میں لکھتے ہیں:

''بعض لوگ خاموشی کو شکست کی آواز سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ تاریخ اور مستقبل سے بے خبر ''حال مست'' ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ خاموشی تو فتح کی پیش خبری ہوتی ہے۔ جب سمندر خاموش ہو یا فضا میں ہوا خاموش ہو تب خاموشی طوفان اور آندھی کی صورت اپنا جلالی روپ دکھاتی ہے۔ سقراط نے زہر پی کر، حسینؑ نے شہید ہو کر اور ابن منصور نے سولی قبول کر کے خاموشی سے صبر کے جو عظیم نمونے دکھائے، بظاہر وہ اُس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست ہی تھی۔ لیکن درحقیقت ان مظلوموں اور سچوں کی خاموشی ان کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔ مظلوموں کی خاموشی کی یہ سچائی ہمیشہ سے قائم ہے۔'' (۶)

انشائیہ ''فاصلے، قربتیں'' میں بھی حیدر قریشی زندگی کی اٹل حقیقتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قربت کا ایک رنگ مرد اور عورت کے تعلق سے عبارت ہے۔ اس قربت کے مختلف مراحل ہیں۔ آخری مرحلے کے اختتام پر فاصلہ وجود میں آ جاتا ہے۔۔۔۔ گویا قربت کی انتہا سے

فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح فاصلے کی انتہا قربت کوجنم دیتی ہے۔'' (۷)

حیدرقریشی نے اپنے انشائیوں میں موضوعات کے تنوع اورعمومیت کا ہرطرح خیال رکھا ہے۔انہوں نے خاموشی،نقاب،وگ،بڑھاپے کی حمایت،اطاعت گزاری،اپنا اپنا سچ جیسے عام موضوعات کوانتہائی مہارت سے پیش کیا ہے یہ تمام انشائیے اپنے اندر گہری معنویت سمیٹے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

موضوعات کے اس تنوع سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حیدرقریشی محض زندگی کے اہم پہلوؤں کو ہی مدنظرنہیں رکھتے بلکہ غیر اہم پہلوؤں کو بھی اپنے گہرے مشاہدات کے ذریعے شاہکار بنا کر پیش کرتے ہیں۔حیدرقریشی کے انشائیے''خاموشی'' کو مدنظر رکھتے ہوئے محمد وسیم انجم یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''حیدرقریشی نے خاموشی جیسے موضوع پرایسا دھماکہ خیز انشائیہ لکھ کرخاموشی کے ایسے تارکش جوڑے ہیں جن پرعمل پیرا ہوکرانسان معاشرے میں پھیلنے والی خلفشار سے بچ سکتا ہے۔یہاں انہوں نےعقل وخرد کے ارتقاء،ایک گھر،ملک اورعالمی سطح پرمعاشرتی اورتہذیبی ہنگاموں کی نقاب کشائی بڑی دانش مندی سے کی ہے۔'' (۸)

ایک اچھےاورکامیاب انشائیہ نگار کے لیےضروری ہے کہ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی ذات کو شامل کرے۔ڈاکٹرسلام سندیلوی اپنےمضمون''انشائیہ کامطالعہ''میں لکھتے ہیں:

''ایک کامیاب انشائیہ نگاراپنے ذاتی تجربات سے قارئین کوآگاہ کرتا ہے،اس لیے وہ کھل کراپنے تجربات ان سے بیان کرتا ہے،یہی نہیں بلکہ وہ ان کواپنے تجربات میں شریک کرلیتا ہےاس لیےانشائیہ کاموضوع ذاتی تجربات کااظہار ہوتا ہے۔'' (۹)

اس نقطہ نظر سے جب ہم حیدرقریشی کےانشائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ حیدرقریشی انشائیہ لکھتے ہوئے اپنی ذات کودرمیان میں موجود رکھتے ہوئے اپنے قاری کواپنے ذاتی تاثرات سے آگاہ کرتے ہیں۔انشائیہ''چشم تصور''میں حیدرقریشی اپنی شخصیت کے مختلف گوشوں اوراپنے تاثرات کوپیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ فلمیں دیکھے بغیر بسر کیا ہے تاہم اس زمانے میں، میں نے بے شمار گیت سنے تھے۔پھر جب میں نے فلمیں دیکھنا شروع کیں تو اپنے پسندیدہ گیتوں میں سے کسی بھی گیت کی پکچرائزیشن مجھے اچھی نہیں لگی۔دراصل گیت سنتے ہوئے ہمارے تصور کی آنکھ وا ہوتی ہے اوروہ اس گیت پراپنی مرضی کاسین فلم بندکرتی ہے۔ایسے سین میں جو بے پناہ معنویت ہوتی ہے ہماری چشم تصور کا کمال ہوتی ہے''۔ (۱۰)

حیدرقریشی اپنے اکثر انشائیے اُن موضوعات پر لکھتے ہیں جو اُن کے ذہنی،فکری اور جذباتی ردعمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کا ہرانشائیہ ان کے شخصی تجربےاورمشاہدے کا حامل نظر آتا ہے۔وہ اپنے دلچسپ اورانوکھے تجربے میں قاری کوشریک ہی نہیں کرتے بلکہ ہم نوا اور ہم خیال بھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔انشائیہ''خاموشی'' میں اپنے ذاتی تجربات اور احساسات کو یوں بیان کرتے ہیں:

''آواز کی دلکشی بھی خاموشی کے پس منظر کی محتاج ہے۔ہوٹلوں اور بازاروں میں پوری آواز کے ساتھ نشر کیے جانے والے گیت سر میں درد پیدا کردیتے ہیں جبکہ وہی گیت آپ رات کومکمل خاموشی کے پس منظر میں مدھم آواز سے سنیں تو آپ خود بھی ان گیتوں کے سروں کے ساتھ جیسے بہتے چلے جائیں گے۔سرگوشی اور دھیمی گفتگو آواز کے خاموشی کی طرف جھکاؤ کے مظہر ہیں۔چنانچہ آپ دیکھیں کہ آوازوں میں جو لطف سرگوشی اور دھیمی گفتگو میں ہے وہ بلند لہجے کی آواز میں نہیں ہے۔'' (۱۱)

انشائیہ''اطاعت گزاری'' میں بھی حیدرقریشی اپنے ذاتی تجربات اورتاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''تجریدی تصویرکی اطاعت گزاری بھی تہ درتہ نتائج (معانی) کی حامل ہے۔آپ نے بڑے افسر کی اطاعت کی تو اس کے منظورِنظر بن گئے۔بڑے افسر کے منظورِنظر بنتے ہی ماتحت عملہ کے اطاعت گزاروں کی ایک فوج آپ کے زیرنگیں آگئی۔گویا افسروں کی اطاعت کرنے والوں کو بھی ایک افسری نصیب ہوجاتی ہے۔آمروں کی اطاعت کرنے والوں کواسی طرح ایک قسم کی

آمریت مل جاتی ہے۔یہ سلسلہ اوپر سے نیچے اور نیچے تک مسلسل جاری وساری رہتا ہے۔'' (۱۲)

ایک انشائیہ میں ''میں''یعنی واحد متکلم کی موجودگی اس کی انفرادیت کا باعث ہوتی ہے کیونکہ یہاں ''میں'' سے مراد خود انشائیہ نگار کی شخصیت ہوتی ہے۔بعض ناقدین اس ''میں'' کو خود کلامی سمجھتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو اس ''میں'' کے ذریعے انشائیہ نگار اپنے قاری کے سامنے ایک کردار بن کر جلوہ نما ہوتا ہے اور اس کا مخاطب قاری ہوتا ہے۔اس ''میں'' کے ذریعے انشائیہ نگار اپنے قاری کو اس طرح کہانی سناتا نظر آتا ہے جیسے وہ اس کا بہترین اور بے تکلف دوست ہو۔ حیدر قریشی بھی اپنے انشائیوں میں اپنی ''میں'' کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے قاری سے گفتگو کرتے ہیں۔حیدر قریشی کا یہ انداز اپنے قاری کو شریک گفتگو کرتے ہوئے اپنی کہانی بیان کرنے جیسا معلوم ہوتا ہے جیسے انشائیہ ''وگ'' میں حیدر قریشی اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے ہی دیکھا کہ اباجی کے سر پر بال نہیں تھے۔ بچپن سے ہی میری شدید خواہش رہی کہ اباجی کے سر پر بال سجے ہوئے دیکھوں۔اس کی دو ممکنہ صورتیں تھیں یا تو کوئی ایسی دوا مل جائے جس سے بال دوبارہ اُگ آئیں یا پھر وِگ سجالی جائے۔ تب وِگ خریدنے کے وسائل میسر نہیں تھے، پھر بھی میں نے ایک بار اباجی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔'' (۱۳)

اسی طرح انشائیہ ''تجربہ کاری'' میں بھی حیدر قریشی کا انداز بالکل ایسا ہے جیسے وہ اپنے ماضی کی داستان بیان کر رہے ہوں:

''میں ابتدا میں کسی معصوم بچے کی طرح سادہ تھا۔جس سے محبت اور خلوص کا اظہار کرتا اس سے سچ مچ محبت اور خلوص کا رشتہ محسوس ہوتا۔رفتہ رفتہ دوسروں کے رویوں سے مجھے احساس ہونے لگا کہ میں کسی ''پینڈو'' کی طرح کسی بہت بڑی آبادی والے شہر کی پرہجوم ٹریفک میں گھر گیا ہوں۔۔۔'' (۱۴)

حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں کے ذریعے معاشرے کے ناہموار اور کمزور پہلوؤں کو

بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔وہ کسی ناصح یا مصلح کی طرح پرزور تقریریں یا مدلل انداز میں اپنے قاری کو نصیحت نہیں کرتے بلکہ اپنے غیر رسمی اور بے تکلف انداز بیاں سے معاشرے کے تلخ حقائق کو اس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو کسی طنز کا بھی احساس نہیں ہوتا اور وہ ایک نئی سوچ کے پیش نظر اصل حقیقت تک بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔انشائیہ ''نقاب'' میں حیدر قریشی لکھتے ہیں:

''ڈپلومیسی کا نقاب آج کل بہت عام ہے۔عام زندگی سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ہر شعبہ حیات میں اس نقاب کو بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔اس کے رواج سے پرتکلف اخلاقیات کا فروغ ہو رہا ہے۔بعض سرپھرے اسے منافقت قرار دیتے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ نقصان سرپھروں کا ہی ہوتا ہے''۔ (۱۵)

انشائیہ ''اپنا اپنا سچ'' میں بھی حیدر قریشی معاشرے کے تلخ حقائق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دنیا میں ہر گروہ اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ خود کو سچا سمجھتا ہے۔ایسا سمجھنے میں کوئی حرج نہیں۔خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جب اپنی سچائی کا اعلان کرنے والا ساتھ ہی دوسروں کو جھوٹا بھی قرار دے دیتا ہے۔ہر شعبہ حیات میں ہر گروہ اپنے حق بجانب ہونے کے دلائل بھی رکھتا ہے اور دوسروں کو جھوٹا بھی پیش کرتا ہے''۔ (۱۶)

حیدر قریشی کے انشائیے زندگی کے تلخ حقائق کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ رنگ لیے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں۔حیدر قریشی اپنے موضوعات کو دنیاوی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے اس کے محاسن و معائب پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ڈاکٹر سلام سندیلوی، انشائیہ میں موجود فلسفہ پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انشائیہ میں صرف فلسفہ ہی داخل نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں اخلاقی قدریں بھی شامل ہو گئی ہیں۔مختلف انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیہ کے ذریعے انسان کے اخلاق کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے،اس طرح انشائیہ میں افادی اور مقصدی رنگ شامل کر دیا گیا۔'' (۱۷)

حیدر قریشی نے بھی اپنے انشائیوں میں اس فلسفیانہ انداز کو برتا ہے۔مثلاً انشائیہ ''نقاب'' میں رقم طراز ہیں:

''انسانی جسم بھی ایک نقاب ہے جسے روح نے اوڑھ رکھا ہے۔روح جسم سے نکل کرفنا نہیں ہوتی بلکہ موت کا نقاب اوڑھ کر اس کی زندگی بن کے دھڑکنے لگتی ہے۔زمانے کی ماہیت پر سنجیدگی سے غور کریں تو ماضی سے مستقبل تک زمانہ نقاب اوڑھے نظر آتا ہے۔مستقبل کے پورے مگر باریک نقاب میں سے ہر لحظہ جھانکتا ہوا''حال'' پلک جھپکتے ہی ماضی کے آدھے نقاب کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور ہم اس لمحے کو چھونے کی پوری طرح دیکھنے کی خواہش دل میں ہی لیے رہ جاتے ہیں۔'' (۱۸)

انشائیہ''بڑھاپے کی حمایت میں'' حیدرقریشی کا یہ انداز یوں جلوہ دکھاتا ہے:

''انسان بچپن میں ضدی ہوتا ہے اور جوانی میں باغی، لیکن بڑھاپے میں ضد اور بغاوت دونوں سے دامن چھڑا کر خودسپردگی اور راضی بہ رضا کے صوفیانہ مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ اولاد جتنی گستاخ، بے ادب اور بے پرواہ ہوگی۔انسان اس صوفیانہ مقام میں اتنا ہی ترقی کرتا جائے گا اور آخر کار اس مقام لاہوت تک جا پہنچے گا جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔'' (۱۹)

حیدرقریشی کے انشائیوں میں شاعرانہ تخیل کے بھی کچھ اثرات ملتے ہیں۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حیدرقریشی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔اس لیے اگر شاعرانہ حسن بیاں حیدرقریشی کے انشائیوں میں نظر آتا ہے تو وہ فطری بات ہے۔انشائیہ''وگ''میں حیدرقریشی کا شاعرانہ انداز بیان کچھ یوں نظر آتا ہے:

''سیاہ رات اس دنیائے موجود کے سر پر زُلف دراز والی وگ ہے۔آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اس زلف پر گرے ہوئے شبنمی موتی ہیں، کہکشاں اس کی مانگ میں بھری ہوئی افشاں ہے اور چاند ایک خوبصورت سنہری کلپ۔یہ دنیائے موجود رات بھر کسی محبوبہ دلنواز کی طرح اپنی زلفوں کی مہک بکھیرتی ہے۔۔۔'' (۲۰)

محمد وسیم انجم حیدرقریشی کے انشائیوں میں موجود شاعرانہ رنگ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حیدرقریشی کے انشائیوں میں ذاتی مشاہدات اور تاثرات نمایاں ہیں اور ان کے اسلوب میں شعریت کا عنصر غالب ہے جس کی لطافت اور تہذیب الفاظ کا معیار فنی تقاضوں کے

عین مطابق ہے۔'' (۲۱)

حیدرقریشی کے انشائیوں میں اُن کی فکروفن سے بھرپور انفرادیت اپنی تمام تر جدت وندرت لیے موجود ہے۔وہ اپنے انشائیوں میں زندگی کے نئے پہلوؤں کو بڑی کامیابی سے سامنے لاتے ہیں۔اسی لیے محمد وسیم انجم حیدرقریشی کے انشائیوں کی تعریف کرتے ہوئے اظہار رائے کرتے ہیں:

''حیدرقریشی کے انشائیے انفرادی اسلوبی خوبیوں سے مالا مال ہیں جن میں بے ساختہ شگفتگی اور سادگی قاری کو اپنا ہم سفر بنا کر ساتھ لیے رواں دواں رکھتی ہے اور قاری انشائیہ نگار کی فکری صلاحیتوں کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' (۲۲)

مختصر یہ کہ حیدرقریشی کے انشائیوں میں مستقبل کے ایک کامیاب انشائیہ نگار کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔کاش ایسا ہو کہ حیدرقریشی ادب کے بہت سارے شعبوں میں جانکاہی کرنے کی بجائے صنفِ انشائیہ پر پُرخلوص توجہ اور ریاضت کا جوہر آزمائیں تو انشائیے کے میدان میں ایک مقامِ فضیلت اُن کا مقدر بن سکتا ہے۔

....

حوالہ جات

۱۔ خاطرغزنوی''جدید اردو ادب''ص نمبر۴۳،سنگِ میل پبلی کیشنز۔لاہور۔۱۹۸۵ء

۲۔ محمد وسیم انجم''حیدرقریشی،فکروفن''ص نمبر۸۵،انجم پبلی کیشنز،راولپنڈی۔۱۹۹۹ء

۳۔ مرتّبین ڈاکٹرشفیق احمد۔ڈاکٹرروشن آرا راؤ''انتخاب انشائیہ نمبر''
ص نمبر۴۹۔کاروانِ ادب،ملتان۔

۴۔ محمد وسیم انجم''حیدرقریشی،فکروفن''ص نمبر۸۶

۵۔ حیدرقریشی''عہد ساز شخصیت''ص نمبر۲۱،نایاب پبلی کیشنز،خان پور۔۱۹۹۵ء

۶۔ حیدرقریشی''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۷۔ حیدرقریشی''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۸۔ محمد وسیم انجم ''حیدر قریشی،فکروفن''ص نمبر ۸۷

۹۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی ''ادب کا تنقیدی مطالعہ''ص نمبر ۲۱۱،
مکتبہ میری لائبریری لاہور۔۱۹۸۶ء

۱۰۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۱۱۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۱۲۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۱۳۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۱۴۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۱۵۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۱۶۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۱۷۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی ''ادب کا تنقیدی مطالعہ''ص نمبر ۳۱۶

۱۸۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۱۹۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۲۰۔ حیدر قریشی ''فاصلے،قربتیں،،(زیراشاعت)

۲۱۔ محمد وسیم انجم ''حیدر قریشی،فکروفن''ص نمبر ۹۳

۲۲۔ محمد وسیم انجم ''حیدر قریشی،فکروفن''ص نمبر ۹۳

تاثرات

حیدر قریشی کی ایک کتاب جوان کے دس انشائیوں پر مشتمل ہے۔''فاصلے قربتیں'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔اس میں انہوں نے جن عنوانات کے تحت انشائیہ لکھے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں، خاموشی، نقاب، وگ، فاصلے قربتیں، بڑھاپے کی حمایت میں، اطاعت گزاری، یہ خیروشر کے سلسلے،چشم تصور، اپنا اپنا سچ، اور تجربہ کاری ہیں۔ان تمام دس انشائیوں میں انہوں نے مختلف کیفیات، زمانے کے نشیب وفراز، سیاسی حالات اور سماجی نیرنگیوں کا ذکر کیا ہے۔ان انشائیوں میں تحریر چست اور برجستہ ہے اور ساتھ ہی فقروں کی چستگی نے ایک شگفتگی کو عیاں کردیا ہے۔عموماً انشائیوں میں اقوال زرین کی تلاش ہوتی ہے۔تاہم میری نظر میں انہیں اقوال زرین کی بجائے فقرہ ہائے بذلہ سنجی سے تعبیر کرنا چاہئے۔جو انگریزی کے Wit & Wisdom کی طرز پر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

حیدر قریشی کے بعض فقرے یا چست اقوال جنھیں میں نے اقوال زرین کی بجائے فقرہ ہائے بذلہ سنجی سے تعبیر کروں گا، جو نہ صرف بڑے چست ہیں بلکہ معنی کا ایک سمندر سمیٹے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غرض حیدر قریشی کے انشائیہ جہاں ہمارے ذہن کو تازگی،فرحت اور شگفتگی عطا کرتے ہیں وہیں دعوت غوروفکر بھی دیتے ہیں اور ہمارے ذوق و وجدان کو مہمیز بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرب استاد(گلبرگہ)

حیدرقریشی کا فکری اورفنی سفرتقریباً تین دہائیوں پرمحیط ہے۔انہوں نے اس عرصہ میں خود کو انتہائی فعال رکھا ہے۔اردو ادب کی بہت سی لہروں کے ساتھ سفر کیا ہے اور بدلتے ہوئے رویوں اور دھاروں کا ساتھ دیا ہےمگر اپنے تشخص کو مجروح نہیں ہونے دیا۔یہی انداز ان کے انشائیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔اپنی ادبی اور عملی زندگی کے لمحوں کو، چاہے وہ کتنے ہی کربناک کیوں نہ رہے ہوں، انہوں نے ایک خوشگوار اسلوب میں پروکر پڑھنے والوں کے لیے سامانِ تفریح بھی مہیا کیا ہےاور لمحہءفکریہ بھی۔اپنے لاشعور میں پرورش پاتے ہوئے کبھی مبہم اور کبھی واضح کرداروں سے انہوں نے طرح طرح کے دلچسپ پہلو نکالے ہیں اور سادہ وپرکار جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کے انشائی پہلوؤں کو بھی خوب خوب اجاگر کیا ہے۔اپنی کیفیات کے ہمراہ قاری کی کیفیات کا بھی لحاظ رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا بھی ان کے تاثرات کو قبول کرتا چلا جاتا ہےاور اسی کشتی میں بہنے لگتا ہے جس میں خود مصنف سوار ہے۔اس طرح ان کے انشائیوں کا مطالعہ ایک رسمی مطالعہ نہیں رہا بلکہ حیدرقریشی کے ذہنی اور ادبی ارتقاء پراثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ بھی بن گیا ہے۔

حیدرقریشی کے انشائیوں میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں ان کی فتوحات اور شکستوں کے ساتھ موجود ہیں جو ان کے انشائیوں میں کہیں خاکہ نگاری کا رنگ بکھیر دیتی ہیں اور کہیں یادنگاری کا،مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ان ساری کیفیات کے پردے سے ایک انشائیہ ابھار لینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں انکساری اور عاجزی بھی نظر آتی ہے لیکن ان دوخوردبینوں کے ذریعے انہوں نے اپنے اردگرد کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات کو Magnify کر کے دکھایا ہے،اس طرح سے کہ ان کے سامنے خود ان کی انکساری اور عاجزی بڑی دکھائی دینے لگتی ہے۔

حیدرقریشی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اپنی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور جو یہ بھی جانتے ہوتے ہیں کہ انہیں کس شعبہءادب کا انتخاب کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔انشائیہ کے حوالے سے انہوں نے جو کام کیا ہے وہ اس صنف میں چند قابلِ قدر انشائیوں کے اضافے

سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حیدرقریشی کی انشائیہ نگاری کی صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے دوسرے انشائیہ نگاروں سے ہٹ کر موضوعات کا انتخاب کیا ہےاور پھر موضوع کے اعتبار سے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو عام قاری کی نظر میں نہیں آسکتے۔ایک اچھے انشائیہ نگار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ان اشیاء،مظاہر اور ان کے چھپے ہوئے گوشوں کو سامنے لائے جو بآسانی دکھائی نہ دے سکتے ہوں۔حیدرقریشی کی انفرادیت کا ثبوت ان کے زاویہءنگاہ میں مضمر ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ بیشتر نظر آنے والی چیزیں ویسی نہیں ہوتیں جیسی دکھائی دیتی ہیں بلکہ بعض اوقات متضاد اور انتہائی مختلف بھی ہوسکتی ہیں۔حیدرقریشی بعض پیچیدگیوں کو اس فنکارانہ مہارت سے پیش کرتے ہیں کہ فلسفہ اور نفسیات کی گتھیاں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔۔۔۔۔

حیدرقریشی کے انشائیوں میں حیرت آمیز تجسس کی فضاء ہمیشہ موجود رہتی ہے اور پڑھنے والا ایک چوٹی یا عروج سے گزر کر نئی چوٹی کے نظارے میں گم ہو جاتا ہے۔اگرچہ ایک خاص موڑ پر انشائیہ کا اختتام پذیر ہو جانا کوئی نئی بات نہیں رہی لیکن حیدرقریشی اب بھی اپنے انشائیوں کو ایک خوبصورت موڑ دے کر ختم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں جیسے ستارہ ٹوٹتے ہوئے خوب روشنی دیتا ہے۔حیدرقریشی کے بیشتر انشائیوں کے اختتام پر دور تک جاتی ہوئی فکر کی ایک لہر مجھے اسی روشنی کے مترادف دکھائی دیتی ہے جس کے ہمراہ آپ ان سمتوں میں نکل سکتے ہیں جس طرف مصنف کا وجدان آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔ **خاور اعجاز**(اسلام آباد)

ان چند انشائیوں کے تعارف سے جہاں حیدرقریشی کے ذہنی میلان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی انشائیہ نگاری غزل کی ریزہ خیالی کے اثر سے چمک کر ان کی تخلیقی نثر میں ان کی پہچان بن گئی ہے۔ ان کے گنتی کے دس انشایئے اپنی ادبی اہمیت کے لحاظ سے اتنے اہم ہیں کہ اگر کوئی نقاد بہت زیادہ بددیانتی کا مرتکب نہ ہوتو انہیں نظرانداز نہیں کرسکے گا۔

ڈاکٹر نذر خلیق(اسلام آباد)

حیدرقریشی اردوادب کا سرمایہ ہیں،جنہوں نے بیشتر اصناف میں اپنی قلمی برتری کا لوہا منوالیاہے۔انہوں نے بحیثیت انشائیہ نگار ایسے انشائیے تخلیق کیے ہیں جن میں اختصار،شگفتگی،اسلوب اورانکشاف ذات کے داخلی،خارجی ہیئتی عوامل شامل ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انشائیہ نگاراپنے جذبات واحساسات کا اظہار انشائیے کے مزاج کے مطابق بڑے تجربے سے کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حیدرقریشی کے انشائیوں میں ذاتی مشاہدات اور تاثرات نمایاں ہیں اوران کے اسلوب میں شعریت کا عنصر غالب ہے جس کی لطافت اورتہذیب الفاظ کا معیارفنی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔آپ شعوراورتحت الشعور کی ایسی سرحد پرتہذیب وثقافت کی زبان استعمال کرتے ہیں جوتمام بنی نوع انسان کامشترکہ ورثہ ہے۔حیدرقریشی کے بکھرے ہوئے مطبوعہ انشائیوں کا ورثہ اب کتابی صورت میں ''فاصلے،قربتیں'' کے نام سے منظرِ عام پر ہے۔جنہیں انشائیہ نگاری کے سلسلے میں بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔انشاءاللہ۔

ڈاکٹرمحمد وسیم انجم (راولپنڈی)

حیدرقریشی صاحب کی نثر کے کئی پہلو ہیں؛ مجھے ذاتی طور پران کے کالم بہت پسند ہیں کیونکہ حالاتِ حاضرہ؛ معاشرے اورخود اپنی شکست وریخت اوراس پر پوری توانائی سے گفتگواورسوچ بچاران کی طرح میرا بھی موضوع ہے جبکہ وہ قدروں کے پیغمبر بھی ہیں اور عامل بھی۔ان کے انشائیے محض لایعنی اشیا کوادب میں خوبصورتی سے جگہ دینے اور یوں اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کومنوانے پرختم نہیں ہوتے بلکہ ان سے متعلق معاشرے کے اصل مسائل اورموضوعات انشائیوں میں حلول کیے ہوتے ہیں جن پرمضمون یامزاح لکھنا آسان ہوتا ہے مگرانشائیہ لکھنااوراس ''غیرہضم شدہ'' صنف میں اپنا پیغام پہنچا دینا آسان نہیں ہوتا۔ان کے انشائیوں کی یہ خوبی قابلِ ستائش ہے اوران میں چھپا خفیف تبسم انشائیے کا تحفۂ خاص۔

فیصل عظیم(امریکہ)

حیدرقریشی پرہونے والا یونیورسٹی سطح کا کام

براہِ راست

۱۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن۔۔۔منزہ یاسمین**

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ سال ۲۰۰۲۔۔۲۰۰۰ء

۲۔**حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جھتیں ڈاکٹرعبدالرب استاد**

پی ایچ ڈی کا مقالہ ۲۰۱۳ء۔گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ،کرناٹک،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی۔حیات وخدمات انجم آراء**

ایم فل کا مقالہ۔۔۲۰۱۳ء۔کلکتہ یونیورسٹی،کولکاتا،انڈیا۔

حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ ھرمے پرتاپ بھانو

ایم فل کا مقالہ،سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہرلال نہرویونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

۴۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات۔۔۔عامر سھیل**

ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔ہزارہ یونیورسٹی،ایبٹ آباد، پاکستان

۵۔**حیدر قریشی کی افسانہ نگاری راضینہ خان**

ایم فل کا مقالہ سال ۲۰۱۳ء۔۲۰۱۴ء۔جواہرلال نہرویونیورسٹی، دہلی۔انڈیا

....

بالواسطہ

۱۔**جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث۔۔۔شازیہ حمیرہ**

سال ۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور، پاکستان سے ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ

۲۔**اردو میں ماھیا نگاری ڈاکٹر صبیحہ خورشید**

سال ۲۰۰۹ء۔ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا سے پی ایچ ڈی کا مقالہ

....

حیدرقریشی انٹرنیٹ کی دنیامیں

ان تین ای لائبریریز میں حیدرقریشی کی تمام کتابیں پی ڈی ایف فائل میں موجود ہیں

http://haider-qureshi.blogspot.de/

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/

http://issuu.com/haiderqureshi

■■■■■■■■■■■

اس ای لائبریری میں حیدرقریشی پرلکھی گئی،مرتب کی گئی کتابیں اوررسالے موجود ہیں

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

ان بلاگس پرحیدرقریشی کی کتب یونی کوڈ میں دستیاب ہیں۔

سوئے حجاز: http://soo-e-hijaz.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

”روشنی کی بشارت“،”قصے کہانیاں“اور بعد کے سارے افسانے

http://hq-kayafsanay.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

خاکوں کا مجموعہ ”میری محبتیں“:

http://meri-mohabbaten.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

یادوں کا مجموعہ ”کھٹی میٹھی یادیں“:

http://khatti-mithi-yaden.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

انشائیوں کا مجموعہ”فاصلے،قربتیں“:

http://inshaiya.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

دوخاص بلاگس

کلکتہ اور دہلی کا سفر،با تصویرروداد

http://haiderqureshi-in-kolkata-delhi.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی کی البم:زندگی تصویروں کے آئینے میں

http://haiderqureshi-album.blogspot.de/

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی کی سب سے پہلی ویب سائٹ

http://haiderqureshi.com/

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

جدیدادب: http://www.jadeedadab.com/

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

وکی پیڈیا پر صفحات

http://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi

عمرِ لاحاصل کا حاصل

http://en.wikipedia.org/wiki/Umr-e-Lahaasil_Ka_Haasil

جدید ادب

http://en.wikipedia.org/wiki/Jadeed_Adab

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

ادبی اعتراف

حیدرقریشی کے بارے میں لکھی گئی اور مرتب کی گئی کتابیں

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن** **مصنف**: **محمد وسیم انجم**

(مطبوعہ۱۹۹۹ء)**ناشر**:انجم پبلشرز،کمال آباد نمبر۳،راولپنڈی۔پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**

مرتبین:**نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے**(مطبوعہ۲۰۰۲ء)

ناشر:اسباق پبلی کیشنز۔پُونہ،انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**

مرتب:**ڈاکٹرنذر خلیق** (مطبوعہ۲۰۰۳ء)ناشر:میاں محمد بخش پبلشرز،خانپور،پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن** **منزہ یاسمین** کاتحقیقی مقالہ

اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے ایم اے اردو کاتحقیقی مقالہ۔سال۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء۔کتابی صورت میں۔۔۔۔۔۔۔۔**ناشر**:میاں محمد بخش پبلشرز۔خانپور۔پاکستان

۵۔**حیدر قریشی سے لیے گئے انٹرویوز**

مرتب:**سعید شباب** (مطبوعہ۲۰۰۴ء)

ناشر:نظامیہ آرٹ اکیڈمی۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

۶۔ادبی کتابی سلسلہ **عکاس** حیدرقریشی نمبر۔۔۔**مدیر ومرتب**: **ارشد خالد**

ناشر:عکاس پبلی کیشنز،اسلام آباد(کتاب نمبر۴۔مطبوعہ اکتوبر۲۰۰۵)

۷۔**حیدر قریشی کا فن** جمع وترتیب:**ارشد خالد،اعجاز عبید**

ای بک۔زیرانتظام اعجازعبید(حیدرآباد دکن)

۸۔**حیدر قریشی کی تخلیقی نثر** **مصنف**:**عامر سہیل**

ناشر:مثال پبلشرز۔فیصل آباد (مطبوعہ ۲۰۱۴)

....

حیدرقریشی پرترتیب دیئے گئے گوشے اور مطالعۂ خصوصی

۱۔گوشہء حیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ ''**اسباق**'' پونہ شمارہ:فروری تااپریل۱۹۹۳ء۔

ایڈیٹر: نذیرفتح پوری

۲۔**حیدر قریشی**(بطورافسانہ نگار)مطبوعہ ماہنامہ''**شاعر**''بمبئی۔

شمارہ مئی تادسمبر۱۹۹۷ء۔**ہم عصر اردو ادب نمبر**... ایڈیٹر : افتخارامام صدیقی

۳۔اشاعتِ خصوصی''دنیائے ادب کا درخشاں ستارہ،حیدرقریشی''ہفت روزہ **ہوٹل ٹائمز**

اسلام آباد۲۲مئی تا۲۸مئی ۱۹۹۸ء۔ مرتبین:اختر رضا کیکوٹی ومحمد وسیم انجم

۴۔گوشہء حیدرقریشی مطبوعہ سہ ماہی''**ادبِ عالیہ**''وہاڑی۔شمارہ مارچ۲۰۰۲ء

ایڈیٹرز:ریاض ہانس وریاض ملک

۵۔خصوصی مطالعہ ''**مہرِامروز**''مطبوعہ ماہنامہ **کائنات** شمارہ مئی۲۰۰۴ء

(اردودوست ڈاٹ کام) ایڈیٹر:خورشید اقبال

۶۔گوشہء حیدرقریشی مطبوعہ ماہنامہ **شاعر** بمبئی شمارہ نومبر۲۰۰۴ء ۔ایڈیٹر:افتخارامام صدیقی

۷۔خصوصی مطالعہ سہ ماہی **ادب ساز** دہلی (تقریباً۵۰صفحات میگزین سائز پر مشتمل)

شمارہ:۶،۷،جنوری تاجون۲۰۰۸ء ایڈیٹر:نصرت ظہیر

۸۔خصوصی مطالعہ''**عمرِ لاحاصل کا حاصل**''

مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد(کتاب نمبر۱۰) مدیر:ارشد خالد

۹۔گوشہ بحیثیت محقق ونقاد مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد

(کتاب نمبر۱۱،مئی۲۰۱۰ء) مدیر:ارشد خالد

۱۰۔مطالعۂ خاص۔**ایک کتاب:''عمرِ لاحاصل کا حاصل''**۔مطبوعہ ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔کتاب نمبر۱۳۔مارچ۲۰۱۱ء۔ مدیرومرتب:ارشد خالد

....